

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ملفوظات



جون ۱۹۴۸



ایک روپیہ

page 33	طاؤوسِ ربابِ اول، طاؤوسِ ربابِ آخر	page 1	مولانا عثمانی علیؒ
page 38	پارٹیاں کس طرح ختم ہو سکتی ہیں؟	page 2	ہماری فرتاریتی
page 47	قرآنی تعلیم	page 3	مجلس دستور ساز پاکستان کی کارروائی
page 54	فلسطین	page 4	پاکستان کے مسلمانوں!
page 102	”علماءِ ہند“	page 6	لمعات
		page 17	حقائق و عبرت

مولانا عثمانی

دیپبرہڑہ کر کہ ۲۲ مئی کو شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے کراچی میں
 حلواسوہن کی ایک دوکان کی رسم افتتاح ادا فرمائی،

علم کا مخزن ہے مولانا عثمانی کی ذات
 پوچھتے ان سے کہ کیا ہے فرد و ملت کیلئے
 پوچھتے ان سے کہ لا دینی سے کہ نیکو جہا
 پوچھتے ان سے کہ ہے اہل تجارت کیلئے
 تانہ ہونے پائے کوئی بات قرآن کی جلاں
 ملک میں کیوں کر ہو آئین شریعت کا نفاذ
 دیکھتے اہل کراچی کا مگر ذوق لطیف
 خوبان لوگوں نے پہچانی ہے مولانا کی قد

پوچھتے ان سے مسلمان معنی فوز و نلاح
 فتنہ ہلے عصر تو میں صورت خیر و صلاح
 دین نظرتے ہتیا کر دیئے کیا کیا سلاح
 نفع کس حد پر حرام اور کونسی حد تک مباح
 ہنری تجویز پر لیتے وزیران سے صلاح
 مشورہ ان سے کیسے قائدِ اعظم جناح
 چاہتے ہیں ان سے حلوے کی دکان کا افتتاح
 خوبان اللہ کے بندوں کو جو جہا سے مداح

کیا عجب ہے کچھ دنوں میں ان سے پڑھوانے لگیں

بس جناح کی نماز اور خطبہ عفت و نکاح

ہماری دستاویزی

بیانات	اگست ۱۹۳۶ء
بیانات	ستمبر ۱۹۳۶ء
بیانات	اکتوبر ۱۹۳۶ء
بیانات	نومبر ۱۹۳۶ء
بیانات	دسمبر ۱۹۳۶ء
بیانات	جنوری ۱۹۳۸ء
بیانات	فروری ۱۹۳۸ء
بیانات	مارچ ۱۹۳۸ء
بیانات	اپریل ۱۹۳۸ء
بیانات	مئی ۱۹۳۸ء

مجلس دستور ساز پاکستان کی کارروائی

جملہ اہلیان پاکستان کی نگاہیں، نبایت بے تابی سے پاکستان کی مجلس دستور ساز کی طرف لگ رہی ہیں اس لئے کہ جب تک پاکستان کا آئین مرتب نہیں ہوتا یہ سرزمین بے آئین رہے گی۔ ۱۰ اگست سے آج تک مجلس آئین ساز نے جو کچھ کیا ہے وہ سب اس کی رپورٹ حسب ذیل ہے۔

۱۰ اگست ۱۹۴۷ء آرمیل سٹر منڈل عارضی صدر منتخب کئے گئے۔ اور روزمرہ کے کارروا، مثل

انتخاب صدر وغیرہ سے متعلق ریزولوشن پاس کئے گئے۔

۱۱ اگست ۱۹۴۷ء انتخاب مستقل صدر۔ قومی جھنڈے کے متعلق ریزولوشن۔ دو کمیٹیوں کی

تعییناتی۔ اراکین کا الائنس مقرر کرنے کے اختیارات

۱۲ اگست ایک اور کمیٹی کی تعییناتی۔ یہ فیصلہ کہ صدر کو منتخب کرنے کا انداز کیا ہو۔

۱۳ اگست لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا مخاطب

۲۴ فروری ۱۹۴۷ء روزمرہ کی کارروائی اور صدر کے اختیارات کے قواعد پر بحث۔ ایک اور کمیٹی

کی تعییناتی۔

۲۵ فروری - تسلسل بحث متعلقہ قواعد مذکورہ صدر

۲۶ مارچ اختتام بحث مذکورہ صدر۔ منظوری قواعد۔ انڈین انڈیا پنڈنس ایکٹ کی

ترسیم کا بل۔

۱۸ مئی روزمرہ کے قواعد و ضوابط کی ترمیمات پر بحث۔

۱۸ مئی

کل ۹ دن

فرمائیے، اب بھی آپ کو گلہ ہے کہ پاکستان کا آئین نہیں بن رہا!

اب اور چاہتے کیا ہو؟ پیسبریں مل چکے!

پاکستان کے مسلمانو!

تم نے اپنی تک کشمیر کی اہمیت کا غالباً صحیح صحیح اندازہ نہیں کیا۔ تم نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ یڑائی سرحد کے پشاور اور کشمیر کے ڈوگرز کی ہے۔ حالانکہ یہ جنگ براہ راست تمہارے خلاف ہے۔ کشمیر کی حفاظت تمہاری اپنی حفاظت ہے۔ تمہارے بال بچوں کی حفاظت ہے۔ تمہاری عزت و ناموس کی حفاظت ہے۔ تمہارے جان و اموال کی حفاظت ہے۔ تمہاری تہذیب و معاشرت کی حفاظت ہے۔ ہر اس شے کی حفاظت ہے جو تمہیں عزیز ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اس کے باوجود تم نے اسے اوروں کی جنگ سمجھ رکھا ہے۔ ہندو کے عزائم بڑے مشہور اور اس کی تدابیر بڑی دور رس ہیں۔ تمہارے سرحدی بھائیوں نے اس وقت تک اپنے خون کی قیمت سے ان کے ارادوں کو مٹی میں ملائے رکھا ہے۔ لیکن وہ تمہارا اس سیلاب کا مقابلہ کب تک کر سکیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ حکومت پاکستان اس باب میں بین الاقوامی قوانین و مصالح سے مجبور ہو لیکن تمہیں کوئی مجبوری نہیں ہے۔ تمہارے بھائیوں کو تمہاری ہر قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ اب تم انگریز کے غلام نہیں ہو کہ تمہاری تگ و تاز فقط جھلک اڈ ہرنال تک محدود رہے۔ اب تم آزاد مسلمان ہو۔ اٹھو! اور اپنے کشمیری محصورین اور سرحدی مجاہدین کی ہر طرح مدد کرو۔ روپیہ۔ کپڑہ۔ دوائیاں۔ اشیائے ضروری۔ جو کچھ بن پڑے۔ انہیں بھیجو اور اس کے ساتھ ہی اپنی دعائیں اور حسین تمنائیں بھی۔ تم مات کرور مل کر ایسی ستمہ آواز بلند کرو کہ دنیا کی قوتیں عدل و انصاف پر مجبور ہو جائیں۔ اگر وہاں استعجاب کی صورت پیش آئے تو وہاں کے مسلمانوں کو ایسی سہولتیں سہم پہنچاؤ کہ ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز مقام متعلقہ تک پہنچانے کے لئے باتیں کم کرو۔ کام زیادہ کرو۔

اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو گی!

سید ابوالحسن علی Nadwi

لمعات

طلوع اسلام اپنے دور اول میں، حکومت کے دفاتری نظم و نسق کے متعلق بہت کم دل چسپی لیا کرتا تھا۔ اس کے وہ ایک بیگانہ حکومت تھی جس کے دفاتری انتظامات کے سن وقوع سے ہماری فی زندگی کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ یوں کہتے کہ اس کی خرابیاں ہمارے لئے مفید تھیں۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ دل چسپی کا موضوع یہی ہو سکتا تھا کہ ملازمتوں میں جو تناسب مسلمانوں کا متعین تھا وہ اس سے محروم نہ رہنے چاہیں۔ لیکن حصول پاکستان کے بعد حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ اب حکومت، ہماری اپنی ہے اور چونکہ حکومت کی مشینری کا انحصار اس کے دفاتری نظم و نسق پر ہے اس لئے اس کے انتظام و نفاذ پر نگاہ رکھنا اندیشہ فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام نے اپنے دورِ جدید میں اس موضوع پر متعدد بار قلم اٹھایا ہے۔ بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس باب میں ہمیں جو کچھ کرنا چاہیے، تقاضا یہی ہے کہ ابھی تک ہم نہیں کر سکے۔ اس لئے آئندہ یہ مسئلہ ہماری توجہ کا زیادہ محتاج رہے گا۔ ہمیں اعتراض ہے کہ دفاتری خرابیوں کے متعلق ہماری معلومات براہ راست نہیں ہو سکتیں۔ لیکن حکومت کے مرکزی مقام پر ہونے کی وجہ سے ہماری معلومات بالواسطہ ہی ہیں، ایسی غیر یقینی بھی نہیں ہو سکتیں کہ ان سے صحیح نتائج مرتب نہ کئے جا سکیں۔ حکومت کے دفاتری نظم و نسق کے متعلق جو کچھ ہم نے علم میں آ رہا ہے وہ نہایت دل خراش اور جوصلہ فر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء میں جس حالت میں حکومت کو اپنے ہاتھوں سے دیا تھا وہیں سے اب سلسلہ آگے چلا یا ہے اور درمیانی نوے برس کا عرصہ (چونکہ عبدالغلامی کا زمانہ تھا اس لئے اسے) اپنی کتاب زندگی سے نکال دیا ہے۔ اس لئے یہ ہیئت مجبوریوں سمجھے کہ ۱۹۴۷ء میں ملک ۱۹۴۷ء کا زمانہ ہے اور کرات موت کی چپکیاں لینے والے نکلے دہلی یا برار لکھنؤی کے جو افسانے سنتے چلے آ رہے تھے وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے حقیقت بن کر آ رہے ہیں۔

گذشتہ دو تین ماہ سے آپ برابر سنتے چلے آ رہے ہیں کہ حکومت کے دفاتری نظم و نسق کا نام "سرایت کچکا" ہے جو اپنی خفیہ تدابیر سے قہر حکومت کی تخریب میں مصروف ہے۔ محترم قائد اعظم، جناب وزیر اعظم اور وزیر مالیات محترم غلام محمد صاحب اور دیگر ارباب بہت دکشادے سنتے رہا اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ یہ تخریبی تویش اندر ہوا اندر ہمارے دفاتری نظام کو متاثر کر رہی ہیں۔ بالعموم یہ وہ لوگ ہیں جو حصول پاکستان سے پہلے بنیاد مسلمان کہلاتے تھے اور جنہوں نے اپنی تمام عمر بھر تک پاکستان کی مخالفت میں گزار دی تھی۔ جنہوں نے اس سے پیشتر بھی لکھا تھا اور اسے بھردہ رہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے اربابِ عمل و عقد نے بار بار کہا ہے اگر وہ حقیقت ہے رادر اس کے حقیقت ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے، تو پھر حکومت نے اس فطرتاً گنتہ کے استیصال کے لئے آج تک کیا عملی قدم اٹھایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم فقیر گوشہ نشین رہنویز ملک سے واقف نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ تو برابر

خود افسروں کا طبقہ بھی بیشتر نالائقوں پر مشتمل ہے۔ نہ صرف نالائق بلکہ بددیانت بھی۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ریٹائر ہونے کے بعد پھر سائید حکومت پر آڈٹس میں آکر کچھ وہ جو ریٹائر ہوئے کی حد تک پیسے چاہنے کے باوجود توسیع ملازمت کی مراعات حاصل کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی اگلے دنوں اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں وزیر اعظم صاحب نے فرمایا تھا کہ حکومت کی پالیسی اس کے خلاف ہے۔ یہ افسران عمر کے اس حد میں پہنچ چکے ہیں جہاں نہ دماغی توازن قائم رہتا ہے نہ عملی توہین برقرار۔ دفتر آتے ہیں لیکن کام کی طرف سے بالکل آپشن یافتہ انہیں کچھ علم نہیں کہ ان کے ہاں کیا ہونا چاہیے اور کیا ہو رہا ہے۔ افسر کیا، دخل خط کرنے کی مشینیں ہیں نے جدت، ادکار نہ ہشش کردار۔ ہر معاملہ میں یہ پوچھنے والے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں تاکہ وہی کچھ ہم کریں۔ اس باب میں ان افسران کے لیے ایسے معقولہ انگریزی ٹیبلے اور حرکتیں سننے میں آتی ہیں جن پر عمل ہنسی ہے اور بدل دوتا ہے۔

افسروں میں لیکر کہ وہ ان لوگوں کا ہے جو ہندوستان میں داخل اور جب کے نالائق شمار ہوتے تھے۔ ساری عمر ہندوؤں کی خوشامد میں گزر گئی تھیں ان کی فوشنوں کی مزاج کی خاطر مسلمانوں کو گالیاں دینا اور ان کے مذہب، تہذیب، تمدن، سیاست کا سھکھ اڑانا ان کا شعار تھا۔ چونکہ دماغ سے بالکل عاری ہوتے تھے اس لیے اکثر ہندو دست کے کاموں میں لگادیے جاتے تھے۔ اسی ہندو دست کے سلسلے میں کسی کمیٹی یا کمیشن کے ساتھ وزارت چلے گئے۔ وہ اسی پر سمجھ لیا کہ خالص صاحب زادے ہیں۔ اب کسی کالے آدمی سے سید سے منہ بات نہیں ہوتی۔ یہ عجیب اختلاف گروہ ہندوستان میں تھیں تفریح اور دل چسپی کا سامان ہو کر تاتھا۔ بلی کے بھانوں پھینکا ڈوتا۔ پاکستان بنا تو یہاں لگتے ہوئے۔ زندگی بھر ہندوؤں کی لائیں کھائی تھیں اب اس کا انتقام اپنے عمل کے خود دار افراد سے لینا شروع کر دیا۔ اب یہ قابل اور خود دلہ افراد ان کمینہ فطرت، بر جو غلط، نالائق افسروں کے سفلہ پن کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور کوئی سننے والا نہیں۔ نالائق ابہرتے ہیں اور قابل ہتے ہیں۔ نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ نہ کہیں دار ہے نہ فریاد۔

اس سے آگے بڑھے تو خویش نوازی اور اقربا پروری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچئے اگر کوئی شخص کسی سے سو روپے کی رشوت لے کر اسے ملازمت دلا دے تو حکومت کی اسپیشل پولیس کا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتا ہے اور پینچنا بھی چاہیے۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اس قسم کے گلے اس طرح گھونٹ دینے چاہئیں کہ یہ سانس لینے کے بھی قابل نہ رہیں۔ لیکن اگر ایک شخص اپنے نالائق بھتیجے کو پانچ سو روپے ماہوار کی ملازمت دیدیتا ہے (یا اپنے اثر سے دلا دیتا ہے) تو یہ کسی قانون کی گرفت میں نہیں آتا۔ حالانکہ ملت اور حکومت کو جس قدر نقصان پہنچا رہا ہے، انفرادی رشوت لینے والا اتنا نہیں پہنچا رہا۔ لیکن ان اقربا نوازیوں اور خویش پروریوں کی کوئی روک تھام نہیں۔ اور ابھی تو فاضل عملہ کی موجودگی کی وجہ سے ملازمتوں کے دوازے عام طور پر کھلے نہیں۔ ذرا نیا ملازمتوں کا سلسلہ شروع ہونے دیکھئے پھر دیکھئے گا کہ اندسے کی روڈیاں کس طرح ہتی ہیں۔

فاضل عملہ (Supplare staff) کے ضمن میں یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ قریب قریب ہوائے کو آئے ابھی تک اس عملہ کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو سکا۔ محترم عبدالرب صاحب فشر

کے بیان کے بموجب رڈ ان ۳۰ افریقہ ۲۰ ہزار سے زائد ملکہ تیناریلو سے ہیں ہے۔ یہ عملہ برابر تھا وہیں پارہا ہے اور ان کے لئے کام کوئی نہیں۔ خور کھینے کے کس قدر دیر پہلے کام صرف ہو رہا ہے۔ اگر آپ تحقیق کریں گے تو اس باب میں بھی آپ کو نظر آئے گا کہ اس گتھی کے جلدی نہ سلجھنے کی بڑی وجہ حکومت کی مشنیری کی سست رفتاری اور افسران متعلقہ کی تساہل انگاری ہے۔ پھر یہی نہیں کہ زائد عملہ ہی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہونے پایا۔ ایسی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بڑی بڑی تھا وہیں پانے والے انسر زائد از ضرورت بھی نہیں۔ یا یہ ہم انہیں کوئی کام نہیں دیا جاتا۔ ہینوں سے ان کی یہ حالت ہے کہ دفتر جاتے ہیں اور یہ دیکھ کر واپس آ جاتے ہیں کہ ابھی تک ان کی تعیناتی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ پھر ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ کام برابر کرتے ہیں لیکن ان کی تنخواہ کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں ہونے پاتا۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بیس بیس سال کی مستقل ملازمت رکھتے ہیں لیکن انہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کی ضرورت نہیں۔ وہ بچارے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کہیں شتوائی نہیں ہوتی۔ کسی کو موصل کر دیا جاتا ہے تو وہ ہینوں تک معلق ہی رہتا ہے۔ نہ اس کے خلاف فرد جرم مرتب ہوتی ہے نہ اسے بحال ہی کیا جاتا ہے۔ کسی کو بیٹھے بٹھائے تنزل کر دیا جاتا ہے اور کچھ نہیں بتایا جاتا کہ آخر کس جرم کی پاداش میں۔ نہ کسی قاعدے کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے نہ قانون کا التزام اندھیر نگری چوہٹ راجہ۔ یہ رو رہا ہے وہ صحیح رہا ہے۔ کوئی سننے والا نہیں کوئی دیکھنے والا نہیں۔ افسران بالا کو اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ کی ہر ہر بازیوں سے فرصت نہیں۔ افسران زیریں جو جی میں آئے کہتے ہیں ایک کے لئے ایک فیصلہ ہے دوسرے کیلئے دوسرا جب حکومت کی مشنیری کی یہ حالت ہو تو اس سے جس قسم کے نتائج مرتب ہوں گے وہ ظاہر ہے، کاغذات، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح دن بھر گردن کرتے ہیں لیکن شام کو دیکھتے تو وہیں کے وہیں۔ کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ کوئی اسکیم آگے نہیں بڑھتی۔ پبلک میں سے کسی بچارے کا ذرا سا کام ان سے پڑ جائے تو پھر دیکھتے وہ بد بخت کس طرح خراب ہوتا ہے۔ حکام اور عملہ میں کوئی رابطہ نہیں۔ عملہ اور عوام میں کوئی مضابطہ نہیں۔ جو چند حساس افراد دیا ننداری سے کام کر رہے ہیں وہ پس رہے ہیں۔ دوسرے ان کے خون اور پسینے کی قیمت پر مزے اڑا رہے ہیں اور نہیں سوچتے کہ جب کشتی ڈوب کر تھی ہے تو۔

نہ کہ رامنزلت باشد نہ مررا



ہم نے سطور بالا میں، کہ جو فی الحقیقت جگہ کے خون سے لکھی گئی ہیں، حالات کا صرف عمومی جائزہ ہے حالانکہ ہمارے پاس ان تصریحات کی تائید میں ٹھوس مثالیں موجود ہیں۔ سردست ہم عمداً اسی کا ذکر نہیں کرنا چاہتے، لیکن اگر حالات کی اصلاح اس طرح سے نہ ہوئی تو ہمیں ان 'تومی مجرموں' کے نقاب اندر دینے میں بھی باک نہیں ہوگا۔ ہم حکومت سے گزارش کریں گے کہ اگر وہ بھی ہم سے متفق ہیں کہ حالات فی الواقعہ اصلاح طلب ہیں تو اس کے لئے ہماری دانست میں ایک ہی تدبیر ہے کہ حکومت چند دیا نندار صاحب فکر و نظر، غیر سرکاری حضرات پر مشتمل ایک مجلس (کیٹی) متعین کرے جسے اصلاح احوال کے

پورے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ ان تک ہر شخص کی رسائی ہو اور وہ ہر مظلوم کی شکایت میں فیر جانبدارانہ تحقیق کرے۔ وہ موزوں حضرات سے شہادت لے کہ حکومت کی مشینری کے استقام و تقاضے کس طرح رفع ہو سکتے ہیں اور وہ کس نہج و سلوب سے عمدہ نتائج کی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ مجلس نام بناد نہیں اور یہ اختیارات کی حامل ہونی چاہیے اور چہرہ اسی سے لیکر وزیر تک ہر ایک اس کے حلقہ دار و گیر کے اندر مضمور۔ اگر حکومت ہم سے تعاون چاہتی ہے تو ہم ایسے افراد کے نام بھی پیش کر سکتے ہیں جو ہماری دانست میں اس عظیم فریضہ کی سر انجام دہی کے اہل ہوں۔ اگر حکومت نے اس اہم فریضہ کی طرف حلد توجہ نہ کی تو میں خدشہ ہے کہ موجودہ نظام خود اپنی اندرونی کمزوری ہی سے نیچے آگے گا اور پھر کسی کے سنبھالنے نہ سنبھال سکے گا۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ

جو متنازع نلاک پوہمشیانہ بنے گا پامائیدار ہوگا

(۲)

تصورت کی کتابوں میں ایک قصہ پڑھا کرتے تھے کہ کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ ایک مرد بضر صحت آئے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں کہ غفلت میں کیوں پڑے ہو۔ انھوں اس مرتبہ کالج آج آکر ہے۔ اس خواب سے ہر دم مت مد ہو۔ اس بزرگ نے اس مرد کو ویش کا شکر یہ ادا کیا اور اٹھ کر اپنے سفر حج کا اعلان کر دیا۔ اعلان سن کر ان کے بڑا نامریدان کی معیت میں بنگلے لے کر تیار ہو گئے۔ اس بزرگ کے مرشد کو معلوم ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ حج کو جانے کا فیصلہ کیسے کیا گیا۔ اس بزرگ نے اپنا خواب بیان کیا تو مرشد نے فرمایا کہ کچھ معلوم بھی ہے وہ مرد و ویش صورت کون تھا؟ وہ ابلیس تھا۔

ابلیس ۹۰ جنسور! اس کا کلیم تو نیک باتوں سے روکنا ہے۔ اس نے مجھے خواب غفلت سے

جگا کر حج کے لئے آمادہ کہوں کر دیا!

تم نہیں جانتے۔ مرشد نے جواب دیا۔ حلیفہ وقت نے جہاد کا اعلان کیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ تم اور تمہارے مریدوں کی جماعت عظیم اس میں شریک نہ ہو سکیں۔ تمہیں اس سے باز رکھنے کا ہی راجح ہوسکتا تھا کہ تمہاری توجہ حج آکر کے خواب کی طرف منتہت کرادی جائے۔ تم شیطان کے ان قدم فریبوں سے واقف رہنا چاہیے جو۔

پاکستان صحت و زینت کے جس دہرا ہے پر کھڑا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دشمن ہر وقت اس نگر میں ہے کہ اس فریضہ کیلئے ملک کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی پامال کر دیا جائے۔ لہذا وقت وہ ہے نہ ہر پاکستانی مسلمان اس کے استقام و بقا کے لئے اپنی پوری پوری کوشش صرف کر دے۔ لیکن ہمیں تو تمہاری ہی میں جو حج اکبرہ کے خواب کے مقدس نقاب میں مسلمانوں کو فری اور نظری مباحث میں الجھانے رکھنا چاہی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ آج کل پنجاب میں یہ اہم بحث مسلمانوں کی توجہات سے لے کر کشش نیا جامہ ہے کہ اسلام میں پردہ کی کیا حیثیت ہے۔ یہ بحث بڑی شدید

سلنے لائی جاتی ہے اور پھر مذاق و مخالفت فریقوں میں جنگ و جدال کا دروازہ کھول کر انہیں بانٹہ بکڑ لٹایا جاتا ہے۔ چنانچہ مناسبت ہے کہ اسی ثواب کو مننے والے گروہ کا اکینہ منشد مذہب پرست یعنی بانٹہ بین لیکر باہر آ گیا اور دو چار بے پردہ عورتوں کی چٹیا کاٹ ڈالی۔ انہوں نے فالسا پولیس کی امداد طلب کی اور ان شاید معاملہ عدالت تک پہنچ رہا ہے۔ اگر ان حضرات سے پوچھو تو یہ کہہ کر گئے کہ شریعت محمد کے ایہم مباحثہ ہیں۔ تو مغربی تہذیب کے سیلاب میں بہت جا رہی ہے۔ اس کی روک تھام کرنا عیدِ مژدہ ہی ہے۔ کوئی ان اجارہ دارانِ شریعت سے پوچھے کہ ابھی کل کا ذکر ہے کہ تبتاوی لاکھوں مستوداتِ ملت کی مائیں، بہنیں، بچیاں، بہتاری عزت و ناموس کی سزنا یہ دار و گہناری فیرت و جھینٹ کی مقیاس۔ جوئی دردوں نے اچک لیں۔ ان کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ ان کی بے حرمتی میں سبیت و سبیت کا کوئی انداز باقی نہ چھوڑا گیا۔ اور اسچی تک قریب یکاس ہزار خواتین ان کے قبضہ میں ہیں۔ کیا بہتاری شریعت میں ان مسائل کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کیا تم نے اس کا پورا پورا انتظام کر لیا ہے کہ آئندہ ان ناشدنی واقعات کا اعادہ نہ ہونے پائے گا؟ کیا تم نے کشمیر کی سرحدوں پر پھرنے والے ڈوگرہوں اور سکھوں کی وحشت آلود آنکھوں کا کچھ مداوا سوچ رکھا ہے؟ کیا تم نے ان خطرات کا مقابلہ کرنے کی لہدی پوری نہیں کر رکھی ہیں جو اب نارغ ہو کر ان معاشرتی مسائل کے حل میں مصروف ہو رہے ہو؟ کیا تم نے زمین کے ان تمام تنگاموں سے فرصت پائی ہے، علمائے آسمان کی فکر نہیں اس طرح ہتھی ہے؟ ان کے لئے سوچو کہ قوم کے سرپرکن کن معاصب و لوازل کے باوجود آئندہ لارہے من اور تم انہیں کن مباحثہ میں لپکتا رکھنا چاہتے ہو؟

میں جاہلت ہوں مجاہدت کا حشر کیا ہوگا

مسائلِ نظری میں مجھ گیا ہے خطیب

اس میں کسے کلام ہے کہ اسلام کے معاشرتی نظام میں ان مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے متعلق ہر صاحب فکر و نظر کو سوچنا ہوگا، لیکن اتنا تو سوچو کہ ان کے حل کھلے گا یا کوشا وقت ہے؟ تادمیج میں پڑھا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے تحت غلطیوں کے دروازے پر ہاتھ نہیں لیکن شہر کے آؤر مسیحی علماء و محققین میں معروف علماء تھے کہ حضرت عیسیٰ نے عشار ربانی میں نظری ردی کھائی تھی یا تمیزی۔ پاکستان کے علماء کو بھی آج ہی قسم کے مسائل میں الجھایا جا رہا ہے۔ ہم اپنے بھائیوں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حج اکبر کے ثواب کا لالچ دینے والے بزرگوں کے مقدس فریب کا دھوکہ نہ کھائیں۔ یہ تھا جسے جان و مال کے دشمن ہیں۔ عزت و آبرو کے دشمن ہیں۔ ملت و مملکت کے دشمن ہیں۔ لیکن اکثر الناس لا یعلمون۔ اس وقت بہتاری تمام قومیں اس امر میں مصروف ہو جاتی چاہیں کہ پاکستان میں کوئی اندوخی خلفشار نہ ہونے پائے کشمیر ہاتھ سے نہ جلتے پلٹے اور آگے بڑھنے تو فلسطین میں غیر مسلحی آؤر قدم نہ جلتے پلٹے یہ ساری مسائل تمہارے آئندہ دستور و آئین کی فروعات ہیں۔ اس آئین کی ترمیم و تدوین کے لئے ایک مرکزی مجلس تشکیل ہو چکی ہے۔ کوشش کرو کہ وہ مجلس بہت جلد اہتمام و انجام دے اور جو آئین وضع کرے

وہ اسلامی خطوط پر مشتمل ہو۔ اس اصل کو سنبھال لیجئے تو تمام فردعات خود بخود سنبھل جائیں گی۔ اصل کو چھوڑ کر فردعات کے پیچھے پڑ جانا، جڑ کو کاٹ کر پانی چھڑکنے کے مرادف ہوتا ہے۔ اس مقدس فریب کو مت پاس آنے دو انہد لکھو عدل و مبین جو شخص تمہیں ان فرعی سادات میں الجھانا چاہے اسے کہہ دیجئے کہ اس سوال کو مجلس آئین ساز تک پہنچا دیجئے اور کوشش کیجئے کہ یہ وہاں سے قانون بن کر نافذ ہو جائے۔ جب یہ چیز قانون بن جائے گی تو ہر ایک اس کی اشاعہ پر مجبور ہو جائے گا۔ ورنہ اگر تم ان فردعات کے پیچھے انفرادی طور پر پڑے رہے اور تمہاری اس باہمی جنگ و جدل میں وہ قوت ہی کمزور ہو گئی جو ان مسائل کو قانون بنا کر نافذ کرنے کے لئے حاصل کی گئی ہے تو تمہاری اس اصلاح سے کیا فائدہ ہو گا! اس قسم کے ناصحین بڑے معصومانہ انداز میں اپنے آپ کو مطمئن بنا کر پیش کیا کرتے ہیں۔ یا د رکھو یہ مطمئن نہیں۔ **اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ**

❖ ❖ ❖
(۳)

مغربی پنجاب کی حکومت کے۔ محکمہ تشکیل اسلامیات میں ایک شعبہ تحقیقات قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ شعبہ محکمہ تشکیل اسلامیات کے ڈائریکٹر مسٹر استاداران کے مستقل عملے کے علاوہ مختلف اخیال علماء پر مشتمل ہو گا۔ اس کا کام یہ ہو گا کہ وہ تحقیق کرے کہ اہم معاشرتی و معاشی مسائل بشمل حرمت سود، اصلاح ذراعت، بیمہ زندگی، سرمایہ اور مزدور کے تعلقات وغیرہ کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے۔ یہ شعبہ اپنی تحقیقات کے آخری منازل میں ماہرین معاشیات کی امداد بھی حاصل کرے گا۔ (بحوالہ ڈان پیج ۱۱)۔ پنجاب کے محکمہ تشکیل اسلامیات کا تذکرہ، سابقہ اشاعت میں محض ضمیمہ اور متبعاً آیا تھا جبکہ ہم نے اس کے ڈائریکٹر مسٹر استاد کے مقالہ "اسلامی آئین سازی" پر تبصرہ کیا تھا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے متعلق کچھ سزیدہ تصویبات کی ضرورت ہے۔

ہم حکومت پنجاب کے اس اقدام یعنی محکمہ تشکیل اسلامیات کے قیام کی ایک ہی بات نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک ملک میں غیروں کا قانون رائج تھا، مسلمانوں کے لئے دین، مذہب کی حیثیت رکھتا تھا۔ مذہب کے لئے کئی اصلاحات، دفعہ و نصیحت اور فتاویٰ وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لئے اس زمانہ میں کسی ایک صورت میں تو ایک طرف، ایک ایک گھاؤں اور ایک ایک فریضہ اس قسم کے اداروں کے قیام کی علت قابل فہم تھی۔ یہ وہ ادارے تھے جو اپنے طور پر مذہبی مسائل کی تحقیقات کرتے۔ لوگوں میں مذہب کا شوق پیدا کرتے۔ دفعہ و تبلیغ سے عوام کو مذہب پرست بناتے۔ ان کی غلط رسوم کی اصلاح کرتے جب وہ مذہبی امور میں مسلک پوچھنے کو آتے تو ان کے لئے فتاویٰ لکھتے۔ وٹس ملی ڈک۔ قیام پاکستان کے بعد، صورت حال مت یکسر بدل چکی ہے۔ اب مسلمان ایک آزاد قوم ہے جس کا بنیادی نصب العین یہ ہے کہ اس مملکت میں شریعت کا قانون نافذ ہو گا۔ یعنی اب یہاں شریعت کے احکام بطور قانون کے نافذ کئے جائیں گے۔ لہذا اب کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ حکومت وہ ضابطہ قوانین مرتب کرے

جسے اسلامی نظام کہا جاسکے۔ اس ضابطہ کو ملک میں بطور قانون حکومت نافذ کر دیا جائے۔ اس کے لئے حکومت کی طرف سے قاضی مقرر ہوں۔ مفتی ہوگی، مشیر ہوں۔ حکومت ہی کے محکمہ قوانین میں تحقیقاتی ادارے ہوں۔ اور یہ سب کام مرکز کے کرنے کا ہے۔ اس لئے کسٹار سے ملک کے لئے بنیادی قانون تو مرکز ہی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ اس بنیادی قانون میں جس حد تک صوبوں کو اختیارات تفویض کئے جائیں گے، وہاں تک قانون کی تنفیذ کی ذمہ داری صوبوں پر ہوگی۔ ان حالات کی روشنی میں پاکستان کے کسی ایک صوبہ میں تشکیل اسلامیات کے لئے کسی محکمہ کا قیام یہ معنی دلدادہ! کیا پنجاب اپنے لئے کوئی حد اگانہ قانون شریعت بنانا چاہتا ہے۔ اور اگر پنجاب ایسا کر سکتا ہے تو پاکستان کے باقی صوبے بھی اپنی اپنی جگہ اسی قسم کے ضوابط قانون بنا سکتے ہیں۔ پھر مرکزی نظام قانون کہاں نافذ ہوگا اور اس کی ترتیب و تدوین کس مقصد کے ماتحت عمل میں آئیگی! اور اگر مرکزی قانون ملک میں رائج نہیں ہوگا تو مرکزی مجلس دستور ساز، صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے، کس مقصد کے لئے عمل میں لائی گئی ہے! یہ وہ سوالات ہیں جو اس اقدام سے فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں جو پنجاب عمل میں لایا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ پنجاب کے محکمہ تشکیل اسلامیات نے بعد از تحقیق یہ فیصلہ کیا کہ زندگی کا بیمہ مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے تو اس کے بعد کیا ہوگا۔؟

(۱) اگر یہ ان کا بھی فیصلہ ہوگا تو یہ تحقیق محض نظری تحقیق ہوگی جس کی اہمیت کچھ نہیں۔ اس وقت بھی بعض لوگ یہ مانتے ہیں کہ زندگی کا بیمہ ناجائز ہے اور بعض لوگ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ اس وقت بھی کچھ لوگ محکمہ تشکیل اسلامیات کی اس تحقیق سے متفق ہو کچھ مخالفت۔

(۲) اگر اس تحقیق کے نتیجہ کو حکومت پنجاب نے بطور قانون اختیار کر لیا تو کیا یہ قانون محض صوبہ پنجاب تک محدود ہوگا۔ لاجالہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ کسی صوبہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنا کوئی قانون صوبہ کے باہر بھی نافذ کر سکے۔

(۳) اگر پنجاب کے تحقیقاتی ادارہ نے یہ فیصلہ کیا اور اسی قسم کے تحقیقاتی ادارے نے جو بنگال میں قائم کیا جائے اس سے مختلف فیصلہ دیا تو پنجاب کے مسلمانوں پر ایک قانون نافذ ہوگا اور بنگال کے مسلمانوں پر دوسرا۔

(۴) اور اگر گل کو مرکز نے اپنے نظام قوانین میں ایسی شق رکھ دی جو اس باب میں پنجاب کے فیصلہ سے مختلف ہو۔ تو اس صورت میں پنجاب میں کونسا قانون نافذ ہوگا۔ مرکز کا یا صوبہ کا! (۵) اگر مرکز کا قانون نافذ ہوگا تو پھر اس صوبائی تحقیقات کے معنی کیا ہیں اور اگر صوبائی قانون

نافذ ہے گا تو پھر مرکز میں آئین سازی کی کوششیں کس کے لئے ہیں!

خوف ہے باکانہ کی گستاخی کی مذمت کے ساتھ ہم تو اتنا ہی سچہ کے ہیں کہ حصول پاکستان کے بعد مسلمانوں کی حکومت سے قوانین شریعت کے نفاذ کا جو عالمگیر مطالبہ شروع ہوا ہے اس رد کی روک تھام کے لئے مختلف

کی حسین کوششیں کی گئی ہیں۔ پنجاب کا تشکیل اسلامیات کا حکم بھی، ہیں تو اسی قبیل سے دکھائی دیتا ہے اس کا تیا م ایسا ہی ہے جیسے انگریزی نظام میں اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج بنا دیے جاتے تھے۔ ان اسکولوں اور کالجوں میں نصاب تعلیم یکسر وہی ہونا تھا جو دوسرے مدارس میں، صرف ایک پیرائے تعلیم قرآن یا دینیات کے لئے الگ کر دیا جاتا تھا۔ عوام خوش ہو جاتے تھے کہ ہماری مذہبی تعلیم کا انتظام ہو گیا۔ پنجاب کی حکومت ابھی تک اسی ڈھب کی ہے جیسے انگریز کے نظام میں ہوتی تھی۔ بس اس میں تعلیم دینیات کے ایک پیرائے کا اضافہ، محکمہ تشکیل اسلامیات کے نام سے کر دیا گیا جو۔ اب عوام خوش ہیں کہ ہماری حکومت نے دین کا حکم مقرر کر دیا ہے۔ یہ وہی "چاند تارا" ہے جس سے آج ہماری ہر غیر اسلامی ادا میں اسلامی بن جاتی ہے۔ کتنا بڑا کھیل ہے جو سادہ لوح عوام سے کھیلا جا رہا ہے۔ نہیں! حد سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے رسول سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے دین سے کھیلا جا رہا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں

۱) حکومت پنجاب کے ان عناصر سے جو اس محکمہ تشکیل اسلامیات کے تیا م کے ذمہ داریاں کہ اگر ان کا فی الواقعہ اس پر ایمان ہے کہ اسلام کے احیاء کی ضرورت ہے تو انہوں نے اس وقت تک اپنی زندگیوں کو اور اپنے نظام حکومت کو کس حد تک لگے نامب میں ڈھالا ہے۔
۲) اور خود محکمہ تشکیل اسلامیات کے ارباب عمل و عقد سے کہ آپ کے محکمہ کی تحقیقات اور فیصلے کس حد تک حکومت پنجاب کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں بدلنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟

اور اگر حقیقت یہ ہے کہ نہ اول الذکر میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور نہ آخر الذکر کے فیصلے حکومت پنجاب کے نظام کو متاثر کر سکتے ہیں تو پھر کیا یہ وہی چیز تو نہیں ہو رہی ہے جسے کھسٹری اور برہمن کی ملی بھگت کہا جا رہا ہے یعنی حکومت اس محکمہ کی کفالت کر رہی ہے اور یہ محکمہ حکومت کے لئے سپر کا کام دیر رہا ہے۔

ہم نے یہ تصریحات کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دی ہیں تاکہ اگر ہم نے کہیں بات سمجھنے میں غلطی کی ہے تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔ اور اگر بات واقعی وہی ہے جو ہم نے سمجھی ہے تو کم از کم مسرتاں در جو اس محکمہ کے ڈائریکٹرز اور جن کے فلوں کے متعلق ہمارے بعض کرم فرماؤں نے شہادت دی ہے، اس کا فیصلہ کر سکیں کہ وہ کہیں نادانستہ ایک کوشش رائگان اور ایک حیثیت سے ذہنوں حاصل کے معادن تو نہیں بن رہے؟

بہارِ جہاد

سابقہ اشاعت میں ہم نے تحریک کی تھی کہ قوم کے قائدین و بالخصوص محترم قائد اعظم کو چاہیے کہ وہ پاکستان کے ساختہ کپڑے کا استعمال شروع کر دیں تاکہ ملک میں کپڑے کی کمی پوری ہو جائے اور بہت سے بیکار افراد کا سب کے معاش کا انتظام ہو جائے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ ہماری یہ آرزو صدی بھر ثابت نہیں ہوئی اور کراچی کی دنیا میں اس باب میں کچھ تحریک پیدا ہوا ہے جس سے پاکستانی ملبوسات کے استعمال کا چرچا شروع ہو گیا ہے۔ لیکن جس انداز سے اس تحریک کو چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ پھر ان ہی فرسودہ اور پامال اہوا پر گامزن ہے جو ہمارے فکری تعطل کی علامت بن گئی ہیں، یعنی لوگوں سے اقرار نامے لکھوائے جاتے ہیں کہ وہ پاکستانی کپڑا پہنیں گے۔ ہمارے خیال میں اس قول و اقرار کی ضرورت نہیں۔ ضرورت وہی ہے جس کا ہم نے

سابقہ اشاعت میں ذکر کیا ہے۔ یہ حضرات اپنے بدیشی سوئوں کو الگ کر دیں اور پاکستان کا بنا ہوا موٹا جھونسا کپڑا زینتاً
 نرنگے لوگوں میں چلنا پھرنا شروع کر دیں۔ پھر دیکھیں، کس طرح ہر سپیکر بلا حلف درجیان، "میڈان پاکستان" بن جانے
 اور دوسری طرف پارچہ بانی کی دستکاری کے لئے حکومت کی طرف سے مراعات دینی شروع کر دی جائیں۔ اس سے آگے
 بڑھیں تو سرکاری ملازمین پر پابندی عائد کر دیں کہ وہ کوئی نیا کپڑا فیروز پاکستانی نہیں بنوائیں گے!
 یاد رکھئے۔ عملی مثال سے بڑھ کر کوئی کچھ مورا نہیں ہو کرتا۔

(۱۵)

میں براہ راست تو کوئی اطلاع ملی نہیں لیکن ایسوسی ایٹڈ پریس کی اطلاع منظر ہے کہ حکومت یو۔ پی
 نے اپنے صوبہ میں طلوع اسلام کا داخلہ قانوناً ممنوع قرار دیدیا ہے۔

ایک دن ہمارے ایک ملنے والے کا حرکت قلب بند جو جانے سے لیکر ایک انتقال ہو گیا۔ ہم نے
 ڈاکٹر سے استجواب کیا کہ انسان کی موت بھی کسی حیرت انگیز شے ہے۔ ابھی یہ بجلے چلنے لگے تھے۔ ابھی ختم بھی ہو گئے
 ڈاکٹر نے کہا انسان کی موت حیرت انگیز نہیں۔ حیرت انگیز تو یہ امر ہے کہ یہ زندہ کس طرح سے رہتا ہے!
 میں حیرت اس پر نہیں ہوتی کہ حکومت یو۔ پی نے طلوع اسلام کا داخلہ ممنوع کیوں قرار دیدیا۔
 حیرت اس پر بھی کہ اتنا عرصہ طلوع اسلام کو یہ اجازت کس طرح دی گئی کہ وہ حکومت ہند کے مسلمانوں تک
 پہنچ گیا کرے! ہماری یہ آواز ہمارے ان بھائیوں تک کس طرح پہنچ سکے گی جن سے ہمارے قلبی رابطہ کا کھسکا
 ذریعہ طلوع اسلام تھا۔ لیکن اگر کسی طرح ان تک یہ آواز پہنچ جائے تو ہم ان سے عرض کریں گے کہ وہ
 گھبرائیں نہیں۔

آئیں گے سینہ چاکاں جن سے سینہ چاک

ہمے گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی

مستند حکومتیں دنیا میں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا کرتیں۔ والظالمون ما لہم من دلی ولا نصیب

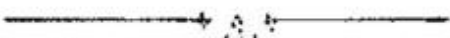
(۱۶)

اس وقت ارض فلسطین مسلمانان عالم کی قوجہات کا مرکز بن رہی ہے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ مسلمانان
 پاکستان کے سامنے اس ارض مقدس اور اس سے متعلقہ مباحث سے متعلق سلولت کی اتنی کمی ہے کہ بہت کم لوگوں
 کو معلوم ہے کہ فلسطین کی تاریخ کیلئے اور اس کا جغرافیہ کیا۔ عربوں کے مطالبات کیا ہیں اور ان کی نوعیت کیا۔ غیر مسلم
 قوتوں کے عزائم کیا ہیں اور ان کی عدت کیا۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے، طلوع اسلام کی اشاعت دواں میں
 فلسطین سے متعلق ایک مبسوط مقالہ شائع کیا جا رہا ہے جو بوجہ گہرے مطالعہ کا مستحق ہے۔ طلوع اسلام کا اپنے تعلق
 آپ ہی خواہ کتنا فرحروزد ساد کھائی دیتا ہے۔ لیکن اس مقالے سے آپ خود ان نتیجہ پر نہیں آئیں گے کہ ہمارے دلچسپ
 اس قسم کی چیزیں کیا ہی نہیں نایاب ہیں اور ان کی ضرورت اشد۔ خدا طلوع اسلام کو تو مین معاف فرمائے کہ وہ اس قسم
 کی کمی کو بھرا کر تار ہے۔ وما تزیق الا باللہ العلی العظیم۔

اشاعت رواں میں ہسٹری نظام کے عنوان سے محترم پروفیسر صاحب کا نہایت بیخ اور عقائد مقالہ شائع ہوا تھا جتنی کہ اسکی کاپیاں بھی پریس میں جا چکی تھیں۔ لیکن فلسطین سے متعلق مضمون اتنا پھیل گیا کہ ان دنوں میں سے ایک روز ہی ماہ رواں میں شائع ہو سکتا تھا۔ موقدکی اہمیت کے اعتبار سے فلسطین سے متعلق مضمون تمام دیکال شائع ہو رہا ہے اور محترم پروفیسر صاحب کا مقالہ آئندہ ماہ پراٹھا رکھنا پڑے۔ اگرچہ ہمیں اس کا جیسا سوس ہے لیکن اس مجبوری کا کیا علاج کہ بازار سے کاغذ ہی دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود کیفیت یہ ہے کہ ہر ماہ رسالہ اپنی اوسط قیمت سے ایک درجہ زیادہ جاتا ہے سستے ہیں کہ۔

گلشن میں علاج تنگی زامان بھی ہے۔

دیکھئے اس علاج کے لئے ہماری باری کب آتی ہے۔



پاکستان کی مجلس دستور ساز نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مرکزی حکومت کا دارالسلطنت کراچی ہوگا۔ اس نہر کو حکومت سندھ سے لیا جائے گا اور اس کے انتظامات مرکزی تحویل میں دیدیے جائیں گے۔

کراچی ہو مرکزی حکومت کے دارالسلطنت بنانے کا سوال کچھ عرصے سے زیر بحث تھا۔ چنانچہ سندھ مقننہ کے گذشتہ اجلاس میں یہ سوال خاص طور پر کوڑ تو جوہر اور سندھ کے ارباب مل دھڑنے اس باب میں بڑی برسیلٹی اور کم ظرفی کا ثبوت دیا۔ اس کے متعلق ہم تاریخ کی اشاعت میں تفصیلی طور پر اپنے خیانات کا اظہار کر چکے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت کے لئے ایک دارالسلطنت کی ضرورت تھی اور جس مقام کو بھی اس مقصد کے لئے سوزوں سمجھا جاتا اس کا مرکزی تحویل میں آنا ناگزیر تھا۔ اگر حکومت نے اپنے مقاصد و مصالح کے پیش نظر اس فرض کے لئے کراچی کو تجویز کیا ہے حالانکہ ہمارے نزدیک مرکزی حکومت کا دارالسلطنت انڈرون پنجاب یعنی راولپنڈی کے قریب ہوتا تو زیادہ موزوں تھا اور کراچی کا صوبہ سندھ کی تحویل میں رہنا بے معنی تھا۔ اس اعتبار سے اس فیصلہ کے خلاف اعتراض کی گئی تھی۔ لیکن مجلس دستور ساز میں مسز کھورو اور مسز نرور کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور ہمیں یہ دیکھ کر اسسوس ہوا کہ وہ اس مخالفت کے جواز میں کوئی معقول دلیل پیش نہ کر سکے۔

اس کے باوجود کہ ہم اصولی طور پر مرکزی حکومت کو اس فیصلہ کیلئے حق بجانب سمجھتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ اس فیصلہ کیلئے موجودہ وقت بہت ناموزوں اور اس کیلئے معاملات سخت نا سادہ تھے۔ مسز کھورو نے اپنے زمانہ وزارت عظمیٰ میں تمام صوبوں میں سنی اور غیر سنی کی چیز ہر پھیلا ہے اس کے اثرات بہت دور تک پھیل چکے ہیں۔ اور یہی وہ زہر ہے جو ہمارے آنے والے پناہ گزینوں کے سندھ میں بے لافیت بیٹے کے راستے میں سنگ گراں بن کر جا رہا ہے۔ خدا خدا کر کے مسز کھورو کو اس پزیرش سے الگ کیا گیا اور اب کچھ تو بے کی جا سکتی تھی کہ پناہ گزینوں کے لئے حالات سادہ کرنا ہو سکتے تھے۔ لیکن میں اس وقت مرکزی حکومت سے کراچی کی علیحدگی کا فیصلہ کر کے مسز کھورو اور اس کے زعماء کو اپنی جہی چوٹی غصت کی بازیابی کا موقع ہم نیچا دیا۔ اب یہ شخص اپنی فتنہ خوانی کو پھر سے جوادے گا۔ اور ذرا دور سے اس کا پردہ مینڈے گیا جائیگا کہ کھورو کے خلاف تمام مہم جنوں کے الزامات اس لئے عائد کیے جاتے تھے کہ وہ کراچی کو مرکزی حکومت کے سپرد کرنے پر تیار نہ تھا۔ یہی اس کا وہ جرم تھا جس کی بابت میں اس سے تدریج سزا دی گئی۔ اس شخص نے یہ سب کچھ بتوں کیا لیکن اپنی قوم سے غداری نہیں کی اور کراچی کو غیر سندھیوں کے ہاتھوں فروخت نہیں ہونے دیا۔ نئی وزارت نے مرکزی حکومت سے یہ سودا کر لیا اور کراچی کو چھوڑا۔ دس ملے پڑا سندھ جہلا کا ملک اور بدترین صوبائی منصب کا مرکز ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ مسز کھورو ایسے سبھیوں کے ہر دین جاتیں گے۔ اور تمام سندھ میں فتنہ کی آگ بھڑکا دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت اس فتنہ کی آگ کو پناہ مشتعل نہ ہونے دے۔ لیکن اس سے ایک خلفشار اور فتنہ تو پیدا ہو جائے گا، جس کا کچھ اور نتیجہ ہو جائے جو۔ کچھ وقت کے لئے پناہ گزینوں پر بھین غرور آجائیں گی۔ ان دنوں سندھ میں جس قدر پناہ گزین آباد ہیں، سندھی قبلا پنے ہی انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اب جس سوال پر سنی اور غیر سنی کے فتنہ کو اس لئے جوادی تھی تو ان بیماریوں کیلئے نئی مصیبتوں کا سامنا پیدا ہو جائے گا۔ جہذا خیال ہے کہ اگر مرکزی حکومت میں فیصلہ چارچھ بیٹے کے بعد کرتی جب حالات زیادہ ساگرا ہو جاتے تو زیادہ موزوں تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا گیا ہے تو فروری ہے کہ اس کے عواقب کیا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ مرکزی حکومت یہ کہے کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ اس فیصلہ میں تاخیر ضرورت رسال تھی۔ اگر یہ صورت ہے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ ان حالات کو ملت کے سامنے پیش کرے تاکہ اس اٹھنے والے فتنہ کا استناد ہو جائے۔ مشکل یہ ہے کہ اداروں کا کام کئی مرتبہ ذکر کر چکے ہیں اور حکومت اچھی لگتا ہے میں اور عوام میں کوئی ناظر پیرا نہیں کر سکی۔ وہ اپنے فیصلوں میں عوام کا اعتماد حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ وہ اپنے فیصلوں کے جواز میں صرف اتنا کہہ دیتا گا کہ جتنی ہتھ کرے۔ روز مملکت تو میں خسرواں دانندہ لیکن ہم حکومت سے ایک مرتبہ پھر عرض کر دیا ضروری سمجھتے ہیں کہ جمہور کی اناہ کے اس دور میں صورت یہ دیں، عوام کے اطمینان کا باعث نہیں ہو سکتی حکومت کو چاہیے کہ اس پالیسی میں اس تمام مصلح و مہتممات کو ملت کے سامنے پیش کرے کہ اس فیصلہ میں جہلت کا موجب تھے، تاکہ عوام خود میں پسند اور فتنہ روک سکیں۔

حقائق و عبرت

علمائے عظام _____ جمعیت العلماء ہند نے اخیر اپریل میں اپنا اجلاس
بہی میں منعقد کیا۔ صدر جلسہ، شیخ الحدیث، جناب حسین احمد صاحب مدنی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت
میں سنا دیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں، بہا تگابھی، پنڈت ہنر اور مولانا آزاد کے اسمائے گری
سہری تروں میں لکھے جائیں گے۔ یہ حضرات مسلمانان ہند کے سب سے بڑے دوست ہیں
ہندوستان مانزیم ۱۳۸

ان ہی شیخ الحدیث صاحب نے ۱۹۲۵ء میں، مرحوم شوکت علی صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس میں اشارہ تھا
جو مظالم آئے دن وفتروں میں ہمشہروں میں اور ریاستوں میں کئے جارہے ہیں اور
جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت ہندو دیوتا، گانڈھی جی اور ہنر صاحب نے
دیہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے انبائے ہن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع
سہن کر سکتے۔

یہی گانڈھی جی اور ہنر صاحب آج مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست قرار دیئے جارہے ہیں اور
ان تمام مظالم اور تعصبات کے باوجود ۱۹۳۸ء سے ۱۹۳۵ء تک ان کی طرف سے مسلمانوں پر دوا
رکھے گئے ہیں۔

آگے چل کر اپنے خطبہ صدارت میں، جناب شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں
تقسیم ہند کے ساتھ ہی مسلمانان ہند اور مسلمانان پاکستان کے مفاد بھی تقسیم ہو گئے ہیں۔

ہمارا فریقہ اب یہی ہے کہ ہم مسلمانان ہند کے مفاد کا تحفظ کریں نہ کہ ان مسلمانوں کے مفاد کا جو سرحد ہند کے اس پار پاکستان میں رہتے ہیں۔ اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان میں شہرہ قسم کے اختلافات رونما ہو گئے تو ہمارا مسلک ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی روشنی میں متبیین ہو گا نہ کہ پاکستان کے مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر وہ اپنے مفاد کی حفاظت آپ کر سکتے ہیں۔

(الغینا)

یہ اپریل ۱۹۷۱ء کا ارشاد ہے۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں اسی جمعیت کے اجلاس (سنگھ لاکھنؤ) کی صدارت ان ہی شیخ الحدیث صاحب نے فرمائی تھی جس میں ایک ریزولوشن یہ بھی پاس کیا گیا تھا کہ جمعیت، عراق، شام، فلسطین، ایران وغیرہ اسلامی مالک پر کسی غیر مسلم قوت کا غلبہ و استیلاء کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس ریزولوشن کی تائید میں، جناب احمد سعید صاحب نے فرمایا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔

اُس وقت یہ کیفیت تھی اور آج حالت یہ ہے کہ یہ حضرات پاکستان کے مسلمانوں سے اس طرح قطع علاقہ اور بیزاری کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اور اعلان کر رہے ہیں کہ اگر کل کو ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی تو ان حضرات کی تلوار بولگی اور مسلمانان پاکستان کی گردن۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں آئے دن مجرموں سے قرآن اور احادیث کے حوالوں سے یہ وعظ سنایا کرتے ہیں کہ

ہیں اے عزیزان ملت اہل اے بقیہ ماتم زدگان قافلہ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں بیروان اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا نام ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم بیروے توجید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سلت کردوڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مرآ کش میں ایک حامی وطن کے طلق بریدہ سے خون کا قوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہلکے منہ سے دل دھجکے کے ٹکڑے نہیں گئے ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی پر لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعت نزع میں

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اٹھ اور اس کے ملائکہ کی چمکا ہو اگر اپنی گردنوں میں اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدان میں نظریں کھڑے تو جس کے سر او سینے صلیب پستوں کی گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں تو ہم اللہ اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں۔ اگر اپنے پیلوؤں کے لذر ایک لٹھ کیلئے بھی راستہ اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چھب جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چھین کو تلوے کی جگہ دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملت اسلام ایک جسم واحد ہے، اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء درجولرح۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چھبے تو جب تک باقی اعضاء رکٹ کرانگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے مدد سے بے خبر رہیں۔ (ابوالکلام صاحب، زاد۔ اہلال ۱۱/۱۹۱۲)

اب تو آپ کو اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ بادشاہوں کے دربار میں جو علمائے کرام زینت وہ مسائید ارشاد و موعظت ہوا کرتے تھے وہ اپنے آقا یا ان نعمت کی خاطر کیا کیا فتوے صادر نہیں فرما دیتے ہوں گے۔ اُس وقت کے اسی قسم کے علماء آج ہمارے اسلاف کی حیثیت سے قابل پرستش بن چکے ہیں اور آج کے حسین احمد اور ابوالکلام آنے والی نسلوں کیلئے قلوب اور ابدال ہوں گے۔

✽

اسلامی دنیا کے یوم تقریب دہراچی میں تقریر کرتے ہوئے محترم ملک فیروز خان صاحب نون نے فرمایا۔

اسلامی حکومتیں

مسلمانوں کو پردہ اٹھا دینا چاہیے کیونکہ یہ ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ انہیں خود قرآن پڑھنا چاہیے اور محض ان باتوں کی پیروی نہیں کرنی چاہیے جو بلا کہتا ہے اس لئے کہ تبار و جع اسلامی سے نا آشنا ہے۔ مسلمانان پاکستان کو ترکی اور ایران کی طرح

دیکھنا چاہیے۔ اور ان ہی سے اسلام کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہی مالکِ اسلامی

اور ترقی یافتہ ہیں۔

۱۰۰/۵

رڈان

ہم اس وقت پردہ کی بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے کہ یہ بحث اہم اور معاملہ نازک ہے اور تمنا اس پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ طلوع اسلام کے پاس اس باب میں متعدد تقاضے پیش کیے ہیں۔ جو بنی اہم موضوعات سے فرصت ملی انشاء اللہ اس معاشرتی مسئلہ پر بھی قرآن کی روشنی میں تفصیلی گفتگو ہو جائے گی اس وقت صرف ہمیں یہ بتانا ہے کہ ان حضرات کے سامنے اسلامی حکومتوں کی بہترین مثال ترکی اور ایران ہے۔ ترکی کا نوں پر ہاتھ رکھ رہا ہے کہ ہماری حکومت اسلامی نہیں۔ غیر دینی (Secular) ہے۔ اصل ایران پر اس ملکیت کی عنایت مسلط ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ہیں ہمارے اکابر جن سے مسلمان توقع وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ کریں گے۔ جو مسلمانوں کو اسلام نہیں کے لئے ترکی اور ایران کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کریں ان کی اسلام نہیں کو ہزار اسلام۔ اس سہاگ سے تو رنڈا پ اچھا۔

لیکن ملک صاحب کو تو پردہ اٹھانے کی مسند دکھا سکتی۔ وہ جس جگہ سے مل جائے اسلامی ہے۔

❖

یوں تو پاکستان ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہی زندہ حقیقت بن گیا تھا لیکن

پاکستانی کے

انہی کی انتظامی تقسیم بتدریج جاری رہی تا آنکہ اپنے علیحدہ سکوں کے بن جانے کے بعد پاکستان کی علیحدگی مکمل ہو گئی۔ اللہ الحمد آج ہم اس قابل ہوئے کہ اپنا سکہ رائج کریں۔ خدا کرے کہ پاکستان کا صحیح مقصد پورا ہو اور ہم اپنا۔ اسلام کا۔ سکہ بھی رائج کر سکیں۔

پاکستانی سکوں میں شاہی تصویر کے بجائے چاند اور ستارہ ثبت ہے۔ یہ ناگزیر تھا۔ لیکن عمومی حیثیت سے ڈیزائن میں ہندوستانی سکوں کی کورانہ تقلید کی گئی ہے۔ ڈیزائن کے علاوہ سکوں پر قیمت لکھنے میں بھی اسی کورانہ تقلید کو رد رکھا گیا ہے۔ ڈیزائن کی تقلید تو ایک حد تک (صرف ایک حصہ تک) قابل معافی تھی لیکن الفاظ کی تقلید مذموم و مردود ہے۔ ہندوستان میں آٹھ آنے کے سکہ پر شہت آنا، اور

پہلے پر، چہار آنہ لکھا ہو اگر تا تھا۔ نہرو کی عارضی حکومت کے زیر اہتمام جوئے کے مفروضہ ہوئے ان پر ہشت آنہ اور چہار آنہ کی بجائے آدھ روپیہ اور پانچ روپیہ ثبت کر دیا گیا۔ یہ اصطلاحیں ہر چند روزمرہ کے استعمال اور عام بول چال کی نہیں تھیں لیکن اس مریض ذہنیت کی آئینہ دار تھیں جس نے اردو کو ہندوستانی بنا دیا تھا۔ ہندوستان میں تو خیر یہ قابل فہم تھا کہ ہندو مسلمان کی ضد میں اردو کا ستیاناس کر کے ہندی کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ لیکن پاکستان میں اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ پاکستانی سکوں پر بھی آدھ روپیہ اور پانچ روپیہ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اصطلاحیں پاکستان میں کہیں مروج نہیں۔ اردو میں کہ پاکستان کی مسلمہ سرکاری زبان ہے۔ ایسا نہیں بولا جاتا۔ صوبائی زبانوں میں بھی ایسے الفاظ مستعمل نہیں۔ اگر بالفرض ہوں بھی تو انہیں مرکزی سندھ داخل نہیں ہو سکتی۔ ہشت آنہ اور چہار آنہ کی قلمی ترکیب پاکستان میں بالکل مانوس تھیں۔ انہیں اور سر نور کج کیا جاسکتا تھا۔ یا اگر یہ مناسب نہ تھا تو ان کی بجائے آٹھ آنہ (اٹھنی) اور چہار آنہ (چوٹی) کو منتخب کرنا چاہیے تھا کہ یہ الفاظ زبان زد عوام ہیں۔

ہم اس تبصرہ کی زحمت کو ادا نہ کرتے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت پاکستان کے کارندے۔ الاما شاہراہ؟۔ ندرت فکر و عمل سے مراد معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا انداز کار و دفتری ہے اور دفتر کا شانی نمونہ ان کے نزدیک ہندوستان ہے۔ پاکستان کے دفتری نظام کو یہ دیکھ چاٹ رہی ہے یہ اکاس پیل دن بدن پھیل رہی ہے اور نظام پیر مردہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کو ان پامال براہوں اور فرسودہ روایات کو لاجالہ ترک کرنا پڑے گا۔

زبان کے معاملہ میں حکومت کو خصوصیت سے محتاط ہونا چاہیے کیونکہ حکومت کی زبان کا عوام پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اگر حکومت کی زبان مستعمل زبان سے مختلف اور غیر مانوس ہوگئی تو ملک میں ایک لسانی الجھن پیدا ہو جائے گی۔ اور یہ الجھن وہی ہوگی جس کا حل ہندوستان میں ابھی تک نہیں ہو سکا۔

پاکستانی وزراء کے مشاغل | معاصر ڈان کا نامہ نگار خصوصی اس دلچسپ خبر کا زمہ دار ہے کہ پاکستان کے وزیر مالیات مسٹر غلام محمد اکا میاشام

کلفٹن کے ساحل پر مصروف تینگ بازی تھے۔ تھوڑی دیر میں ایک اور وزیر پاکستان مسٹر غضنفر علی بھی آگئے اور وہ بھی تینگ بازی میں بھائی وزیر کے شریک بن گئے۔

لب ساحل مشاغل رنگین بھی ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ یہاں کے نغارے جلالی بھی ہوتے ہیں اور جمالی بھی۔ انگلستان اور دیگر مہذب ممالک میں ساحل ان مقامات میں شمار ہوتا ہے جہاں عقل کا پاسبان دل کے پاس نہیں رہتا۔ ادھر پانی کا حلال ہوتا ہے، ادھر انسان کا جمال۔ بگلوں اور دیگر ساحلی اور آبی جانوروں کی دلچسپی زیادہ تر افادہ یاتی پہلوئے ہوتی ہے۔

اقبال کو ساحل کی ہنرم آرائی سے اصولی اختلاف تھا کہ۔ آجنا

نوائے زندگی زخم خیز است

اقبال نے محض اظہار اختلاف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مشورہ دیا کہ

بدربیا غلط و باموحش در آدین

حمایت جادواں اندر ستیز است

ہمارے وزراء اقبال سے اس حد تک تو ضرور اتفاق کر سکتے کہ ساحل تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ وہ آگے بڑھے لیکن پادر آب نہیں ملے پادر ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کے ہنگاموں سے فارغ ہو چکے ہوں اور سعدی کے الفاظ میں آسمان پر دازی شروع کر دی ہو۔ یا ہوا کو آب پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وزارت — بلکہ خود پاکستان — باداود ہے۔ یعنی آندھی کے میر۔ لیکن میثاق بہر حال اچھی تھی کہ پاکستان میں ہنوز سہوائی قطعے تعمیر ہو رہے ہیں۔

—:—

اچھوت عمر بھرا چھوت رہتے ہیں۔ موت کے بعد ہو سکتا ہے کہ کسی اور جون میں ازلی اچھوت ظاہر ہوں۔ موت سے پہلے ان کی ذات کی تبدیلی کا سوال خارج از بحث ہے

مسلمانوں نے بھی ہندوؤں سے متاثر ہو کر اپنی معاشرہ میں وہی ذات پات پیدا کر لی ہے جو نظری طور پر ہی نہیں عملاً ساری دنیا میں سوائے ہندوؤں کے متروک و مذموم ہے۔ پاکستان میں سرکاری ملازمین میں اچھوتوں کی ایک جماعت ہے جسے ماتحت عملہ کہتے ہیں۔ اس کی حیثیت صرف اس قدر ہے کہ وہ برہمن افسروں کی خدمت کرے اور اسی میں اپنی نجات سمجھے۔

ایک مرتبہ ہم نے ایک انتہائی قابل نفرت بورڈ کا ذکر کیا تھا جس سے مرکزی حکومت کے کچھ دفاتروں کا ایک دروازہ، صرف افسران کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہ بورڈ تو اب اتر گیا ہے لیکن۔

مردِ جعفرِ زندہ روح او ہنوز

کے مصداق یہ علامت تو نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے لیکن مرض بدستور موجود ہے۔ اس کی ایک اور مثال پاکستان نیشنل گارڈز ہے جس کا تیسرا ماسٹریٹ میں لایا گیا تھا کہ غیر فوجی افراد ملت کو فوجی تربیت دی جائے اور انہیں تیار کیا جائے تاکہ وہ بھی بوقت ضرورت ملک و ملت کا تحفظ کر سکیں۔ اس جماعت میں سرکاری افسر بھی شامل ہیں اور ماتحت بھی۔ بجائے اس کے کہ اس عسکری جماعت میں اس اخوت و مساوات کا عملی مظاہرہ کیا جاتا جس کا شور حکومتی حلقوں سے اکثر بلند ہوتا رہتا ہے، یہاں قاعدہ یہ بنایا گیا ہے کہ سول محکموں کے افسر یہاں بھی افسر ہوں گے۔ چنانچہ کئی ماتحت عملہ کے ایسے افراد جو پہلے سے تربیت یافتہ ہیں اور جنہوں نے یو۔ ٹی۔ سی یا ایسے اداروں سے فوجی ماسٹریٹ حاصل کر رکھی ہے اور جو اپنے ہمراہیوں کو سکھانے میں معین و مدد ہو سکتے ہیں انہیں غیر تربیت یافتہ افسروں کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ اس طرح نہ محض ان کی تربیت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ خواہ مخواہ کی تفسیح اوقات بھی کی گئی۔ اور یہ تفریق بھی روراکھی گئی کہ سول کا افسر یہاں بھی افسر ہے خواہ وہ سطرینج کے پیادے جتنا بھی نہ ہو۔ اس جماعت میں یہ ایسی اصولی خرابی ہے جو اسے کامیاب نہیں ہونے دے گی یا اسے اس راہ پر ڈال دے گی جو ہماری منزل کی طرف نہیں جاتی۔

ہمیں امید ہے کہ حکومت ادھر توجہ کرے گی اور اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کرنے کے خیال سے ہی اس قابل مذمت تفریق کو ختم کر دے گی۔

—:—

ملی ترانہ کیا ہے کہ پشتو میں ایسا قومی گیت لکھا جاسکے جو سکولوں کے بچے پر جم کٹائی یاد دہانہ مکتوبوں پر لکھا جائے۔ گیت کا مرکزی خیال پاکستان سے وفاداری ہوگا۔ صحیح مرکزیت کے نہ ہونے سے پاکستان میں صوبائی انتشار ہے اور ہر صوبہ بھولے گل جن پر بسا لگا دیا ہم جن اپنی اپنی جداگانہ راہ پر بے ہمار جا رہا ہے۔ قومی ترانہ کا مسئلہ صوبائی نہیں بلکہ مرکزی ہے اور حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کا قومی ترانہ کیا ہو؟ جہاں تک ہمیں علم ہے حکومت پاکستان نے اس ضمن میں ابھی تک کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج صوبہ سرحد کو پشتو میں علیحدہ قومی گیت کی ضرورت محسوس ہوئی، پاکستان سے وفاداری، کی شرط کا اعلان کر کے صوبہ سرحد نے اس نفسیاتی الجھن کا اعتراف کیا ہے جو موجودہ بے مرکزی کے دور میں ناگزیر ہے۔ یہ شرط دراصل صوبائی ترانہ کے لئے معذرت ہے۔ سرحد اپنے لئے قومی گیت تجویز کرے گا تو اس کی دیکھا دیکھی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور بنگال بھی اپنے اپنے جداگانہ قومی گیت وضع کر لیں گے۔ دیگر صوبوں کے پاس بھی وہی معقول وجوہات ہوں گی جو صوبہ سرحد کے پاس ہیں۔

صوبہ سرحد پاکستان سے نام نہاد وفاداری کے لباس میں پٹھانستان کے اس پوئے کو از سر نو پانی دے رہا ہے جسے خان برادران نے بویا تھا اور جس کی آبیاری کانگریس نے کی اور استیصال مسلم لیگ نے۔ تعجب ہے کہ جو شے خان برادران کے ہاتھوں میں اکاس ہیل نظر آتی تھی وہ مسلم لیگ حکومت کے ہاتھوں میں آکر خوشنما پھول بن جاتی ہے۔ آج پشتو میں ایک قومی گیت وضع ہو گا کل پشتو بولنے والے ایک علیحدہ قوم بن جائیں گے۔ اس طرح غیور پٹھانوں نے

جس لاش کو استصواب کے ہاتھوں دفن کیا تھا اس کی کاپیا کلپ کر کے اسی کا تحفہ خان بھائیو کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ ابھی اگلے دن وزیر اعظم پاکستان نے کہا تھا۔

میرے نزدیک صوبائی عصیت ہی تنہا وہ خطرہ ہے جو نہ صرف مملکت پاکستان کو کمزور ہی کر دے گا بلکہ اس کی سہتی کو فنا کر دے گا۔ جو لوگ صوبائی عصیت کی تبلیغ کرنے میں وہ مملکت پاکستان کے ہلک ترین دشمن ہیں۔

صوبائی عصیت کی تبلیغ کرنے والے تو پاکستان کے ملک ترین دشمن ہیں۔ لیکن اس کی عملی ترویج کرنے والے؟ وہ پاکستان کے دشمن نہیں بلکہ اس کی حکومت ہیں! خان برادران بھی تو پٹھانستان کے دعویدار ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان سے وفاداری کا عہد کرتے ہیں۔ ان کے دعوؤں کو مفاد مانتے ہوئے حکومت سرحد کے اس فعل کو کیسے سراہا جاسکتا ہے؟ جان نہیں ایک ہی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو پھر رد عمل میں تفادوت کیوں؟

ہم اس صوبائی انتشار کے لئے خود مرکزی حکومت کو ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ قومی ترانے کے معاملہ میں کئی اور معاملات کی طرح حکومت پاکستان نے مناسب ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ اس جانب عاجلانہ توجہ کی ضرورت تھی لیکن حسب عادت ادھر بھی بے اعتنائی کو ہی رد رکھا گیا ہے۔ طلوع اسلام کی مارچ کی اشاعت میں ہمارے دو نامہ نگاروں نے قابل توجہ مشورے دیئے تھے ان کو اس سلسلہ میں پیش نظر رکھا جاسکتا ہے۔ حال کی خبر یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے قومی ترانہ مدون کرنے والے کے لئے دس ہزار روپیہ کی پیش کش کا اعلان ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ ہنوز اپنے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر پایا۔ انڈین حالات حکومت کو کم از کم اتنا تو چاہیے کہ مرکزی فیصلہ ہونے تک صوبائی کوششوں کو روک دے۔ حکومت پاکستان میں صوبہ کا ہد کانہ ترانہ چہ معنی دارد؟ پاکستان اپنے لئے جو ترانہ منتخب کرنے لگا وہی صوبوں کا ترانہ ہوگا۔ صوبہ سرحد کے اس اقدام کو رد کانہ گیا تو ہر صوبہ اپنا اپنا علیحدہ بہت کھڑا کر لے گا اور اس کا نتیجہ صوبائی قومیت ہوگا، جس سے اسلام کی جڑ کٹے گی۔

۳۔ قوم کے غم میں! | ان خواتین کے رنگین ملبوسات کی بھرک ادران کی روپہلی آوازوں کی

کھنک نے، لارنس باغ کی فضا کی رنگینیوں میں اور بھی اضافہ کر رکھا تھا۔ (ڈان ۶۲)

معلوم ہے کہ یہ کس اجتماع رنگ و نعر کی رونماد ہے اور وہ کون سی خواتین ہیں جن کے روپہلی نعمات اور سنہری ملبوسات کا تذکرہ جلیلہ جہان تصور کو اس طرح دامانِ باغیاں و کعبہ گل فروش بنا رہا ہے؟ یہ رونماد ہے اُس مینا بازار کی جسے "مستوراتِ لاہور کی پناہ گزینوں کی کمیٹی" نے پناہ گزینوں کی امداد کے سلسلے میں ترتیب دیا تھا اور جس میں ہمارے ممتاز راہنمایان ملت کی بیگمات نے حصہ لیا تھا، یہ اُن پناہ گزینوں کی امداد ہو رہی ہے۔ جن میں ہماری لاکھوں مائیں اور بہنیں ایسی ہیں جنہیں ستر ڈھانپنے کے لئے چیتھر تک میسر نہیں۔ جن کے شیر خوار بچے ایک گھونٹ دودھ کی خاطر بلک بلک کر جان دے رہے ہیں۔ جن کے معصوم کم سن ایک کبل کے نہ ہونے سے سردی سے اکر کمزور رہے تھے جنہیں آسمان کی نیلی سواق کے سوا کوئی چھت نصیب نہیں۔ یہ ان کی امداد کے لئے لارنس باغ کی مست فضاؤں میں مسرتوں کے جھولے جھلائے اور خوشیوں کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ مظلوموں اور بے کسوں کی پتا شانے کے کیے حسین انداز ہیں! دن بھر طرب و نشاط کی محفلیں گرم کیں۔ شام کو دو دو چار چار پیسے اکٹھے کر کے ریلیف فنڈ میں بھج دئیے۔ اخبارات میں ان پیش بہا تقریبوں کا چرچا ہوا۔ ریڈیو نے اس ایثار کے ڈھول پیٹے۔ بلگم صاحبہ کی ملی خدمت پر میاں صاحب نے مونچھوں پر تباؤ دیا اور انہیں آئندہ ایکشن کیلئے لیگ کا مکٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ نہ ہونے آج سان العصر (حضرت اکبر الہ آبادی) در نہ معلوم ان کی صدائے دردناک کیا کچھ کہتی!

یہ ریلیف فنڈ بھی ہمارے لئے عجیب تماشے کا موجب بن رہے ہیں۔ کسی ڈرامٹک کمپنی کا نئے نئے سینے سیزنوں سے کیل ہوا کسی مینما کا فریب نگاہ افتتاح، کسی مغنی آتشِ نفس کی محفلِ رقص و سرود ہوا کسی بھانڈے کا تاشا۔ ایک عشر کا اعلان ریلیف فنڈ کے لئے کر دیجئے، پھر دیکھیے ان میں شرکت کس طرح نہ صرف ملی خدمت ہی میں شمار ہوتی ہے بلکہ کارِ خیر ہونے کی وجہ سے ثواب کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ دنیا اور آخرت کی "برکات" اس طرح حاصل ہوتی ہیں! کس قدر بہ نجت ہیں وہ جو

اب بھی محروم رہ جائیں!!

آؤ۔ آگے بڑھو۔ قوم پر ایسی افتاد روزِ روز نہیں بڑا کرتی!

پس از مدت گذار اتقاد میں جا کاروانے را!!

تہذیب کا مال | امریکہ نے ایک ایسا "جرہری بادل" ایجاد کیا ہے کہ جس سے تمک ہو اختم ہو گیا۔ یہ بادل، ایٹم بم سے بھی زیادہ اثر انگیز ہے اور اس کی طاقت آفرینی کی تاثیر بہت دیر پا ہے۔ بس اتنا ہی نقص ہے کہ اگر کہیں ہوا کا رخ بدل جائے تو یہ پھر اپنوں کو بھی اسی طرح ہلاک کر دینگا۔

نیز امریکہ نے اب ان ایٹم بموں سے بھی بڑے بڑے بم ایجاد کر لئے ہیں جو اسے جاپان کے خلاف ہتھیار کئے تھے۔

علامہ بریں ایسے لیے قاطع حیات جراثیم پیدا کر لئے گئے ہیں جو اس قسم کی جیلدیاں پیدا کر دیں گے جن سے انسان کبھی جانبر نہ ہو سکے۔ یہ اس قسم کی ایجادات ہیں کہ اگر آئندہ جنگ ہوئی تو اس کا فیصلہ ساٹھ دن کے اندر اندر ہو جائے گا۔ (مہندستان ٹائمز، ۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ء)

یہ ہے اس ترقی کی معراج جس کے نزدیک زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اور بس!

انساں کہ رُخ زغاڑہ تہذیب بر فرد وخت
دیدم چو جنگ پر دہ ناموس بس ماد درید
خاک سیاہ خویش چو آئینہ دا نمود
جز بسفک الداماء خصم بسین نمود

دوسرا سین | جرہری میں اس وقت ستر لاکھ عورتیں ایسی ہیں جنہیں کبھی شوہر نصیب

نہیں ہو سکتا۔ اس حساب سے، وہاں ہر تیسری باغ عورت ایسی ہے جسے یا تو عمر

بھر بلا شوہر رہنا ہو گا۔ یا پھر ایک زوجگی کی مرد جو رسم کے خلاف، کسی بیوی دے

کو شوہر بنانا ہو گا: (ڈان - ۱۹ ستمبر ۱۹۵۴ء)

اسی قسم کی تھیں وہ تمدنی ضروریات جن کے لئے اسلام نے تعدد ازواج کا حل تجویز کیا تھا لیکن

جس کی تمام "ہندب دنیا" اس طرح ہنسی اڑاتی تھی۔ اب حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ ہندب دنیا "اسی" دقتا نویسی "علاج کی طرت رجوع کر رہی ہے۔ لیکن ہندب دنیا کی یہ ہنسی درحقیقت، قرآن کے اس علاج کے خلاف ہنیں تھی بلکہ مسلمانوں کے اس طرز عمل کے خلاف تھی جس میں انہوں نے اس ددائی کو بطور غذا استعمال کرنا شروع کر دیا اور جس میں ہر پوہلوس نے حسن پرستی شعار کی

قرآن میں تعدد ازدواج کا ایک جگہ رصرت ایک جگہ، ذکر ہے اور وہ اس انداز سے ہے کہ اگر قوم میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ مرد رشتلاً جنگ میں (ضائع ہو جائیں تو لاوارث خاندانوں کی پرورش کا انبساط یہ ہے کہ اس بیوہ ریا خاندان کی کسی اور مناسب خاتون سے شادی کر لی جائے خواہ پہلی بیوی موجود ہو اور تم دیکھو کہ اس طرح اس کی حق تلفی نہیں ہوگی) اور اس طرح دو دو، تین تین، چار چار خاندانوں کو اپنی کفالت میں لے لیا جائے تاکہ ان کی پرورش کا انتظام اس انداز سے ہو جائے کہ ان کی غیرت کو بھی ٹھنسی نہ لگے اور قوم بہت سی اجتماعی خرابیوں سے بچ جائے۔ یہ اجازت سورہ نساء کی تیسری آیت میں ہے اور امتیوں سے متعلق احکام کے ضمن میں آئی ہے اس وقت ان ہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیلی طور پر کبھی پھر لکھا جائے گا، یہ تھی تعداد ازدواج کی اجازت کی شکل اب اس کے بعد دیکھیے کہ مسلمانوں نے اس اجازت کی کس طرح سٹی پلید کی ہے اور کس طرح اس تمدنی علاج کو اپنی ہوس کا مرانی کا مضمکہ انجمن اور رسوا کن ذریعہ بنا لیا ہے جس سے اسلام جیسا دینِ فطرت ساری دنیا کی نگاہوں میں اٹھو کہ بن کے رہ گیا۔

ہوئے تم دوست جس کے ہاں کا دشمن آسماں کیوں ہو!

جادو وہ جو... قائد اعظم شیر کشمیر حضرت شیخ محمد عبداللہ (علیہ ما علیہ) نے مشرقی پنجاب

میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔

مذہب کا رشتہ انسانوں کو متحد کرنے کا ذریعہ بہت کم ہوا ہے۔ وہ رشتہ جو سب سے

مصنوبہ اڈڈ قابل شکست ہے، معاشی رشتہ ہے۔ زمانہ زات اندیا۔ ۱۲/۳۳

واہ۔ واہ! سچی بات کس طرح بے ساختہ نکل گئی ہے اس عبدالدینار کے منہ سے!! اس میں کیا کلام ہے کہ پیسے کا رشتہ ہی حقیقی رشتہ ہے۔ ورنہ دنیا جانتی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور شری بیت پیش ہیں کیا وجہ لگانا گت ہو سکتی ہے؟

شاعروں کی قوم | حکومت ہند کے وزیر و نافع، سردار بلدیہ سنگھ نے مقننہ کے اجلاس میں یہ انکشاف فرمایا کہ ان کی "نیشنل کیڈٹ کور" (قومی جماعت عسکریت) میں، درجہ اعلیٰ یونیورسٹی اور کالجوں کے لئے ہے جو 32,500 رضا کاران پر مشتمل ہے اور درجہ ثانوی، اسکول کے لڑکوں کا ہے جس میں ایک لاکھ بیس ہزار رضا کاران ہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

"یہ تو ہنوز ابتدا ہے" (اسٹیشن ۱۳)

اس پر ہم نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ ہمارے کالجوں کے نوجوان، قومی فوج میں کیوں دلچسپی نہیں لے رہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ شاعروں کی قوم ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ فوج اور لشکر سب بیکار چیزیں ہیں۔

مرنے والا تو نقطیات پر مہلتا ہے

اس لئے یہ سب درد ساری کا بیکے لئے!

سندھ میں پیر الہی بخش صاحب کی وزارت عظمیٰ کے قیام کے ساتھ ہی، شرعی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ شروع

سندھ میں قانون شریعت

ہو گیا ہے۔ چنانچہ حکومت سندھ کا ایک منشور، مطبوعہ ڈان مورفہ ۱۹۵۵ء منظر ہے کہ

حکومت سندھ نے حکم دیا ہے کہ ٹوڈی۔ ڈیسی اور انگریزی شراب کی تمام دکانیں جب

لے ان صاحب نے یہ القابات خود اپنے لئے تجویز فرمائے ہیں۔

کے دن اور چند ایک تعطیلات کو بذرا با کریں گی۔ البتہ جوٹل، کلب اور کینیٹن اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

فرمائیے! اب بھی آپ کو گدھے ہے کہ پاکستان اسلامی حکومت نہیں اور اس میں تو اینن شریعت کا نفاذ نہیں ہوتا؟ اب تو حضرت پیر الہی بخش صاحب ایدۃ اللہ بنصرہ یقیناً اس کے مستحق ہو چکے ہیں کہ ان کا اسم گرامی جمعہ کے خطبوں میں داخل کر دیا جائے۔

اب اس کے بعد اگلا منشور اس حکم پر مشتمل ہو گا کہ جمعات اور جمعہ کی درمیانی شب تمام قحبہ خانے بند کر دیئے جائیں۔ جوٹل اور کلب اس حکم سے بھی حرب معمول مستثنیٰ رہیں گے۔

اور کیا عجب ہے کہ شعبان کے آخری دنوں یہ منشور بھی شائع ہو جائے کہ رمضان المبارک کے احترام میں ایک مہینہ کیلئے رشوت بھی بند کی جاتی ہے البتہ عدالتیں اس حکم سے مستثنیٰ رہیں گی۔

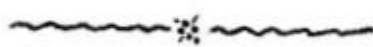
❖

سابقہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ دنیا میں ہر کام کے لئے قابلیت اور استعداد کی ضرورت ہوتی ہے بجز مسند حکومت کے اس پر فائزین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب قلم طراز ہیں:-

آپ کو صرف اسی پر حیرت ہے کہ کرسی حکومت پر فائز ہونے کیلئے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کا مقام اس سے ذرا آگے بڑھ کر آتا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کرسی حکومت پر بیٹھنے والا ہی اپنے آپ کو ملت کا بہترین دماغ سمجھنے لگ جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کی بیگم صاحبہ بھی نوراً لیڈرانی بن جاتی ہیں۔ میاں لڑکوں کے کالج کا افتتاح کرنے ہمارے پاس تو بیوی صاحبہ زرسنگ ہوم کے تقسیم انعام کے جلسہ کی صدارت فرما رہی ہیں۔ وہ یوم استقلال کے جشن مسرت میں سنت شبیریری کی تلقین فرما رہے ہیں اور یہ پردہ باغ کی نمائش میں اسوۂ فاطمیہ کی تقلید کی تاکید کر رہی ہیں۔ حالانکہ نہ انہیں معلوم ہے کہ سنت شبیریری کے غایات کیا ہیں اور نہ انہیں پتہ کہ اسوۂ فاطمیہ کے مختصیات کیا ہیں؛ لیکن باہیں ہمہ وہ مردوں کے واحد قائلہ ہیں اور یہ عورتوں

کی امام۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ بالآخر یہ قیادت و امامت کن خصوصیات کی بنا پر آپ کے حصہ میں آئی ہے۔ خدا حافظ ہے اس قوم کا جس کی قیادت اس طرح سے بٹ رہی ہو۔ جو لوگ اپنی ذاتی جاہ اوروں تک کا انتظام نہیں کر سکتے۔ انہیں امور سلطنت کا نظم و نسق سونپ دیا جاتا ہے۔ اور جو سبکیات اپنے گھر بھی درست نہیں رکھ سکتیں وہ تعمیر امور مت کا فریضہ سنبھال لیتی ہیں۔ اگر ان ہی کی زندگیوں کو ہم کے لئے باعث تقلید بنیں تو

خدا میں سخت جہاں را یار بادا!



چودھری خلیق الزمان صاحب نے کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

عیش! پاکستان میں تو این شریعت، بالخصوص شرعی حدود و سزائوں کے نفاذ کا وقت ابھی نہیں آیا۔ یہ تعزیری قوانین اس وقت تک نافذ نہیں کئے جاسکتے جب تک مسلمان اپنی اصلاح کر کے سچے مسنوں میں مسلمان نہ بن جائیں جس ملک میں کامل متقی اور پیر سیرگار لوگ نہ بستے ہوں وہاں ایسے قوانین کا نافذ کر دینا جن کی رو سے چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ یا زانی کو سنگسار کر دیا جائے۔ بڑا خطرناک ہے

(دُان ۲۰)

بالکل درست! جب تک ملک میں جرائم پیشہ اور بد معاش لوگ موجود ہیں اس وقت تک تعزیری قوانین کا نافذ کرنا بڑا خطرناک ہے۔ قانون تو ہونا ہی شریفوں کے لئے ہے۔ بد معاشوں اور غنڈوں کے لئے قانون کی کیا ضرورت۔ مسلمان پہلے اپنی اصلاح کر کے سچے مسنوں میں مسلمان بن جائیں۔ ہر طرف متقی اور دیندار لوگ دکھائی دیں۔ پھر ان کے ہاتھ بھی کاٹنے اور سنگسار بھی کیجئے۔ کیا محال جو کوئی سلسلے سے اُن بھی کر جائیے۔ بد معاشوں کو سزائیں دینا واقعی خطرناک ہے۔ اگر یہ خطرناک نہ ہوتا

۱۷ کیا ہم چودھری صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ سنگساری کی سزا قرآن کی کوئی آیت میں آئی ہے؟

طاؤس میں رباب اول، طاؤس میں رباب آخر

عمل کے صالح یا غیر صالح ہونے کا معیار وہ نتائج ہیں جو اس سے مترتب ہوتے ہیں۔ ہر وہ عمل جو کسی مقصد کو سامنے رکھ کر نہ کیا جائے یا جو پیش نظر مقصد کے حصول کو ممکن اور سہل نہ بنائے عمل غیر صالح ہے اور عبث۔ انسان نے اپنی طویل مدت حیات میں جہاں خصوصی اغراض اور وقتی مصالح کے تحت کوئی غلط راہ اختیار کی تو اس پر چل نکلنے کے بعد وہ ایسا بھٹکا کہ اس سے رجعت نہ ہو سکی۔ چنانچہ باوجود چلتے چلنے اور چلتے رہنے کے منزل صبح دور سے دور تر ہوتی گئی۔ ایسے راہ گم کردگان نے غلطی کا کشادہ دلانا اعتراف کرنے کے بجائے یہ خود فریبانہ نعرہ ایجاد کیا کہ "کوشش بیہودہ ہے۔ از خفگی، کشمکش حیات میں خفگی کے نتائج ظاہر ہیں لیکن اس پر کوشش بیہودہ کو بھی تو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ قرآن نے کفار کے اعمال کے متعلق کہا ہے:

حبطت اعمالہم فی الدنیا والآخرۃ

ان کے اعمال دنیوی اور اخروی زندگی میں ان کے کسی کام نہ آئے اور ان کی فوز و فلاح کے ضامن نہ بن سکے۔ کفار بے عمل نہیں ہوتے۔ وہ کوٹھوکے بیل کی طرح چلتے رہتے ہیں۔ البتہ ان کے چلتے رہنے سے منزل طے نہیں ہوتی۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ان کے اعمال نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔

ہم نے اشاعت مارچ میں حکومت اور ملت کے مابین خلا کے اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ اگر حکومت کا محکمہ اطلاعات فرسودہ، دقیانوسی اور بے منزل راہوں پر چلنے کی بجائے صحیح خطوط پر کام کرے تو خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکیں گے۔ ادھر یہ مخلصانہ مشورہ ہمارے قلم سے صفحہ قرطاس پر آ رہا تھا اور ادھر ایوان حکومت میں "رابطہ عوام" کی عجیب و غریب کھجڑی پک رہی تھی۔ ہمیں یہ دیکھ کر از حد قلق ہوتا ہے کہ ارباب حکومت پاکستان عمومی اعتبار سے مقلد محض ہیں۔ وہ انہی

پامال راہوں پر چل رہے ہیں جن پر ان کو ہندوستان میں چلایا جانا رہا ہے۔ ان کا عاجز تخیل خوب تر نظاروں تک پہنچ نہیں سکتا۔ ان کا فکر شکستہ، پرفس میں پھریٹا سکتا ہے لیکن آزاد فضا کی پھیائیوں کا تصور نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں جنگ کے دوران میں ادارہ یونائیٹڈ پبلیکیشنز کے زیر اہتمام مختلف رسالے مختلف زبانوں، عربی، فارسی، اردو، پشتو وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ وہ ادارہ سرکاری تھا اور رسالے عام ادبی انداز کے تھے۔ البتہ ان کے جذبات میں جنگی کوائف اور اتحادیوں کے عزائم و کارگزاری پر مخصوص انداز میں تبصرے ہو کرتے تھے۔ اتنی سی تلخی کے لئے اتنی واقف مشیرنی، بیا اور ضائع کی جاتی تھی۔ ان رسالوں کو دیکھ کر خیال آتا تھا کہ یا تو ان سے وابستگان نے انگریز کو خوب ہی الو بنا رکھا ہے اور اپنی مطلب براریوں کے لئے اسے استعمال کر رہے ہیں یا انگریز خود اس بظاہر حقیر جنگی پروپیگنڈے کو اتنا موقع سمجھتا ہے کہ اس قدر گراں مصارف کا متحمل ہو رہا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو جنگ کے دوران میں اس قسم کی ذہنی تفریح اس لحاظ سے کم از کم قابل فہم تھی کہ جنگی مصائب نے اذہان و اعصاب پر جو خاص قسم کا دباؤ ڈال رکھا تھا، ہلکے پھلکے رسالے بعض لوگوں کے اس دباؤ اور کوفت کو وقتی طور پر کم کر دیتے تھے۔ اس پر مستزاد جنگی مقاصد کی تبلیغ تھی جو غیر محسوس طور پر ہو رہی تھی۔

لیکن پاکستان میں اس عیاشی اور اسراف کے لئے کیا جواز ہے؟ دہلی کے (یونائیٹڈ پبلیکیشنز کے) مرحوم رسالوں کے ادارے تحریر زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھے۔ وہ حضرات اب پاکستان تشریف لے آئے ہیں۔ چنانچہ سوال پیدا ہوا۔ پاکستان کی گونا گوں مشکلات کا ذرا اندازہ فرمائیے!۔ ان کی کھپت کیسے ہو۔ اس سوال کا جواب "ما وجدنا علیہا باءنا" سے آگے ان افکار نو سے عاری دماغوں میں آہی کیا سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی طرف مڑ کر دیکھا اور حل فوراً سامنے آ گیا کہ ان بیکارا دہوں کے لئے سابقہ شغل مہیا کر دیا جائے۔ چنانچہ یکم اپریل سے حکومت کے باب عالی کی جانب سے ماہنامہ "ماہ نو" کا اجرا کر دیا گیا۔ یکم اپریل کی تاریخ میں — شاید نادانستہ طور پر — یہ کنایہ ہے کہ حکومت نے قوم کو "اپریل فول" بنایا ہے۔

ماہ نو، اور عام ادبی رسالوں میں بدیہی فرق یہ ہے کہ یہ سفید کاغذ چھپتا ہے اور اس کی قیمت آٹھ آنے ہے۔ اس وقت کوئی اردو رسالہ سفید کاغذ پر نہیں چھپ سکتا۔ کیونکہ سفید کاغذ کے استعمال کے لئے حکومت سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے جو دستیاب نہیں ہوتا۔ لیکن اس سرکاری مجلہ کے لئے سفید کاغذ مہیا کر دیا گیا ہے۔ پھر اس کی قیمت نسبتاً بہت کم رکھی گئی ہے۔ گویا حکومت اپنے سرکاری اثر و اقتدار کا ناجائز استعمال کر رہی ہے۔ کارکنانِ رسالہ اور مضامین نگاروں کو بھی معقول معاوضے دیئے جاتے ہیں۔ ایک طرف حکومت عوام پر ٹیکس بڑھا رہی ہے اور دوسری طرف خرچ کی یہ کیفیت ہے کہ بے کاروں پر روپیہ پانی کی طرح بہا جا رہا ہے۔ ہم حکومت سے پوچھتے ہیں کہ ایک ادبی رسالہ کے اجراء سے حکومت نے بالآخر کونسا تعمیری کام کیا ہے؟ کیا اچھے افسانے، میاری اشعار اور لطیف ادب حکومت کا انحصار *Monopoly* ہیں؟ کیا غیر سرکاری رسالوں میں یہ خوبیاں منقود ہوتی ہیں یا پیدا نہیں کی جاسکتیں؟ کیا ڈرامے، افسانے، گیت اور غزلیں قوم کی ان تمام مشکلات کا حل پیدا کر دیں گے جن کا روزنامہ وقت رو یا جاتا ہے۔ خدا کے لئے کوئی بنائے تو سہی کہ بالآخر وہ کونسی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لئے یہ ادبی رسالہ جاری کیا گیا ہے؟ حکومت کی یہ غلط بخشی ہمارے نزدیک ان قرونِ ماضیہ کی مسرفانہ یاد ہے جب دربار شاہی میں خوشامدانہ قصائد کے ایک ایک شعر پر شاہی خزانوں کے منہ کھول دیئے جاتے تھے۔ اور شاعر کا منہ موتوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب کسی کو بھوک نہیں ستایا کرتی تھی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ پاکستان میں ہمہ گیر خلفشار ہے۔ لاتعداد مہاجرین کی بحالی، لباس و خوراک کی کمیابی اور گرانی، متوقع بروز گاری مستقبل سے متعلق عدم اطمینان، غرضیکہ پاکستان کی یہ نوموہود مملکت تنوعِ مصائب سے دوچار ہے۔ یہ حکومت اور ملت کے مشترکہ مصائب ہیں۔ ان کا ازالہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکومت اور ملت یک جان ہو کر مصروف کار نہ ہوں۔ حکومت ملت کا اشتراک حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس پر اعتماد کرے اور اسے بازو دے۔ حکومت نے اس ضمن میں کیا کیا؟

صرف یہ:

لے ہم ماہ نو سے بعد ادب گذارش کرتے ہیں کہ یہ تحریر رسالہ پر تبصرہ نہیں بلکہ حکومت کی پالیسی پر تنقید ہے۔

۱) ایک ادبی مجلہ ماہ نو جاری کر دیا۔

۲) ایک آدھ پرس کا نفرس میں سرکاری ملازمین سے خطاب کر دیا۔

۳) اخبار ڈان میں حکومت کا نقطہ نگاہ کے تحت چند مضامین شائع کرا دیئے۔

جب تو میں زندگی کے حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو ان کی نشا طر و شاعری ہوتی ہے۔ شاعری اور زندگی متضاد چیزیں ہیں۔ مسلمان اول و آخر شاعر ہے۔ یوم اقبال پر شاعر سے اور تو ایسا ہوتی ہیں۔ رابطہ عوام شاعری اور ادب لطیف سے ہوتا ہے۔ ماہ نو، ایک شعر ہے! اچھا یا برا؟ نتیجہ ایک ہے! زندگی سے فرار! ڈان میں حکومت کی طرف سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ حکومت کے ایما پر نہیں ہوئے بلکہ اس طرح اخبار مذکور نے اپنے صفحات میں مزید دلچسپی کی صورت پیدا کی۔ لیکن انیسویں کا مقام ہے کہ حکومت نے اس موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس نے دفتری قسم کے چند بیانات دیدیئے جس میں خود ستائی تھی اور تعلق، اور کہیں کہیں تکلفانہ انکسار تاکہ تعلق کی ناگواری گراں نہ گزرے۔

ہم حکومت سے پھر گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو جمہور کی آواز بنائے۔ ملت کو یقین دلائے کہ حکومت ملت کی ہے اور خود اس کا ثبوت دے کہ وہ ملت کو اپنی ملت سمجھتی ہے۔ موجودہ طریقے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے نہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے محکمہ اطلاعات کو زندہ مثال اور قومی شعبہ کی حیثیت سے سرگرم کار ہونا چاہئے اسے حقائق کو پیش کرنا اور حقائق کا اعتراف کرنا چاہئے۔ اب حقائق سے کھیلنے یا چشم پوشی کا وقت نہیں۔ پاکستان ایک حقیقت ہے وہ افسانہ ہے، نہ شعر۔ زندگی بجائے خود نہ افسانہ ہے، نہ شعر۔ ہم میدان جنگ میں ہیں۔ زندگی سہمی بیہم سے اور جہاد مسلسل۔ شاعری زندگی کے حقائق سے گریز کا نام ہے۔ عرصہ حیات میں جیت مردانہ کار کی ہوتی ہے اور نام بھی مجاہدوں اور سرفروشلوں کا ہی بلند ہوتا ہے۔ پاکستان ابھی 'ماہ نو' ہے، لیکن وہ شعر و ادب کا مرقع نہیں، نہ افسانوں کا پلندہ۔ بلکہ اس تاریخی حقیقت کا حل کہ 'خنجر ہلال کا بے قومی نشان ہمارا' اس مستقبل کا آئینہ دار کہ

— درستیہ تو ماہِ تہماے نہارہ اند — اور اس قرآنی صداقت کا مصداق کہ

ان مکنتھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نہو عن المنکر

حکومت کو اگر رسالوں سے اس قدر شغف ہے تو وہ ایک ایسے رسالے کی کمی کو پورا کرے جو پاکستان سے متعلق ضروری دستاویزات، معلومات اور اعداد و شمار پیش کرے۔ پاکستان سے متعلق معلوماتی مضامین شائع کرے جن کی ضرورت اندرون پاکستان بھی ہے اور بیرون پاکستان بھی۔

’ناہ نو‘ کے مدیر کے پاس اچھا قلم ہے، لیکن وہ اسے بہر کیف اسی مصرف میں لاسکتا ہے جو مصرف حکومت اس کے لئے متعین کرے۔ وہ ایک اچھا معمار ہے آپ اس سے جی چاہے مندر بنوا لیجئے، جی چاہے مسجد۔ ہم ارباب حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ قوم کے روپیہ اور فاضل ادیبوں کی قابلیتوں کو شاعری اور افسانہ نگاری کے ’طاؤس و رباب‘ میں ضائع نہ کرے بلکہ اس سے تعمیر ملت کا کام لے۔

کیا حکومت ان گذارشات کی روشنی میں، اپنے فیصلہ اور اقدام پر نظر ثانی کرے گی؟

پارٹیاں کس طرح ختم ہو سکتی ہیں؟

۲۰۔ اپریل کو پشاور کے ایک اجتماع عام کو مخاطب کرتے ہوئے قائد اعظم نے اس دور تازک سے متعلق انبیاہ فرمایا جس سے پاکستان دوچار ہے اور اس امر پر زور دیا کہ موجودہ قومی ایگزیکٹو میں صرف ایک سیاسی پارٹی ہونی چاہئے۔ چنانچہ آپ نے مشورہ دیا کہ وہ (یعنی عوام) ان حشرات الارض قسم کی سیاسی جماعتوں کا خیال چھوڑ دیں جو سابقہ خلاف پاکستان عناصر کی خدمت میں تنظیم ہیں۔ لہذا آپ متحد ہو کر مسلم لیگ سے وابستہ رہئے کیونکہ تنہا اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔

اس فرمودہ کا سبب لباب یہ ہے کہ پاکستان میں ایک پارٹی ہونی چاہئے جو سوائے مسلم لیگ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ اسی نے پاکستان حاصل کیا ہے۔ حصول پاکستان سے پیشتر ملت اسلامیہ ہندیا و مسلم لیگ کو ایک سمجھا جاتا تھا۔ خود مسلم لیگ کا دعویٰ ہی تھا۔ لہذا اب یہ کہنا کہ تنہا مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا ہے صحیح ضرور ہے لیکن اس سے صحیح تر یہ ہے کہ ملت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔ اب مسلم لیگ اور ملت میں یہ لفظی فرق کیوں روا رکھا جا رہا ہے؟ کیا اس لئے کہ ملت کی جدوجہد کو تنہا مسلم لیگ کی جدوجہد کہہ کر آئندہ کے لئے جماعتی کامیابی کے امکانات روشن کئے جائیں؟

یہ تقریر ایک بنیادی مسئلہ سے متعلق ہے جس پر عمومی بحث ہم سابقہ اشاعت میں کر چکے ہیں۔ محترم قائد اعظم پاکستان کے موجودہ گورنر جنرل ہیں اور اپنی بلند ترین شخصیت کے پیش نظر نئے آئین میں وہ امیر پاکستان ہوں گے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی شخصیت کا مشورہ کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا قائد اعظم کی انفرادی خواہش ہے کہ پاکستان میں — کم از کم جب تک ایگزیکٹو کی صورت باقی ہے — صرف ایک پارٹی ہو

یہ موجودہ اور آئندہ کے قاعدت کا ناطق فیصلہ ہے۔ خواہش کی صورت میں تو معاملہ ختم نہیں ہو جاتا اور رائے کا حق اور موقع باقی رہتا ہے۔ البتہ فیصلہ کی صورت میں دیکھنا ہو گا کہ مسلم لیگ کے علاوہ دیگر جماعتوں کو حکماً بند کر دیا جائے گا یا انھیں ایسی مراعات نہیں دی جائیں گی کہ وہ مسلم لیگ کی قابل ذکر حریف بن سکیں۔ دونوں حالتوں میں حکومت وقت اس الزام سے بچ نہیں سکے گی کہ وہ آزادی رائے اور حریت فکر پر ناجائز پابندیاں عائد کر رہی ہے اور ایک فکری استیلا و آمریت مسلط کر رہی ہے۔ آئین و قواعد جمہوریت کی رو سے یہ کسی طرح مستحسن نہیں ہو سکتا کہ ایک پارٹی کو قائم رکھا جائے اور باقی پارٹیوں کو جبراً ختم کر دیا جائے۔

صرف ایک ہی پارٹی کا وجود آمریت کا دوسرا نام ہے۔ اٹلی، جرمنی اور روس میں ہی صورت حال تھی یا ہے۔ چنانچہ یہ حکومتیں خالصتاً آمرانہ رہیں یا ہیں۔ ارباب مسلم لیگ یقیناً اس قسم کی آمریت کے خواہشمند نہیں۔ اس سے بہتر قسم کی فضا ترکی میں تھی۔ وہاں الغائے خلافت اور قیام جمہوریت (۱۹۲۳ء) کے ساتھ ایک ہی پارٹی کے وجود کو قانونی حیثیت دی گئی اور دیگر جماعتوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ یعنی کوئی تیس سال بعد دوسری جماعتوں کو سیاست میں دخیل ہونے کی اجازت دی گئی۔ گو تفصیلی اطلاعیں بیرون ترکی نہیں آئیں تاہم جو خبریں آتی رہیں ان سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ جو مخالف جماعتیں میدان انتخاب میں آئی ہیں ان کی وہی مشکلات و شکایات ہیں جو گذشتہ انتخابات عامہ میں پنجاب مسلم لیگ کو یونیٹ حکومت کے خلاف تھیں۔ وہی سرکاری اقتدار کا ناجائز استعمال، مخالف جماعت کی راہ میں طرح طرح کے موانعات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ

ترکی کا ایک پارٹی کا تجربہ کس قدر کامیاب رہا؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ کوئی مستند شہادت اس کے متعلق موجود نہیں۔ البتہ یہ حقیقت کہ دوسری جماعتوں نے برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف طرح طرح کے الزامات لگائے اس کی غمازی کر رہی ہے کہ صورت حال خاطر خواہ نہیں تھی، دوسری پارٹیوں کا معرض وجود میں آجانا اور ان کا حاکم پارٹی کی مخالفت میں اس اشتہاد کا اظہار کرنا اسی کا آئینہ بردار ہے کہ انھوں نے تیس برس جبر و اکراہ سے گزارے اور قانون کے ڈر و خاوشی سے

ہو سکتا ہے کہ ترکی کا نظام حکومت کامیابی سے چلتا رہا ہو لیکن وہ کامیابی اعتباری اور اضافی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ نظام اسلامی نہیں لہذا ہمارے لئے قابل تقلید مثال نہیں۔

جمہوری طرز حکومت کی صحیح مثال کہ جس کی اساس پارٹی حکومت پر ہے، انگلستان ہے، جہاں ان دنوں حزب عمال برسر اقتدار ہے۔ پارٹی گورنمنٹ کا یہ خاصا ہے کہ حکومت صرف ایک ہی پارٹی کے افراد تک محدود رہتی ہے۔ خواہ وہ افراد قابلیت، اہلیت اور تجربہ کے لحاظ سے ان سے کمتری کیوں نہ ہوں جو اس پارٹی کی حدود سے باہر ہیں۔ موجودہ حزب عمال اوسط درجہ کی قابلیت کی جماعت ہے۔ اس جماعت کے علاوہ انگلستان میں ایسے حضرات موجود ہیں جو حکومت کا تجربہ اور اہلیت کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ وہ انگلستان اور شاہ انگلستان کے دیسے ہی وفادار ہیں جیسے ارکان حزب عمال۔ لیکن انھیں شریک حکومت اس لئے نہیں کیا جاتا کہ حاکم جماعت کے ارکان نہیں۔ ان کا ذاتی جوہر اور قابلیت ملک اور قوم کے کام اس لئے نہیں آسکتا کہ وہ ایک ایسی جماعت کے ارکان ہیں جو انتخابات میں نسبتاً کم ووٹ لے سکی ہے۔

پارٹی گورنمنٹ میں ہی ایک عیب نہیں کہ معیار انتخاب جو ہر ذاتی کے بجائے رکنیت جماعت ہو جاتا ہے بلکہ حزب مخالف کا فریضہ محض مخالفت رہ جاتا ہے۔ چونکہ اس کے پیش نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرے اس لئے وہ صلاح یا تعمیری تنقید کے بجائے ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی ہے کہ مخالفت کی خاطر مخالفت کرے اور جاوبے جا عیب جوئی کر کے حکومت کو بدنام و ناکام کرے۔ حزب مخالف کا منصب تنقید و تعاون لہذا اصلاح نظام قومی نہیں رہتا بلکہ جب وہ تنقید کرتی ہے تو اس کی ایک آنکھ ووٹ دینے والوں پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارلیمانی مباحثوں میں بیشتر افراط و تفریط ہوتی ہے اور اعتدال و توازن غائب ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس برسر اقتدار پارٹی اس مفروضہ کو کبھی فراموش نہیں کرتی کہ حزب مخالف، مخالفت برائے مخالفت کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو حزب مخالف کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتی بلکہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اس کی تنقید کو ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ غیر ارکان کو نہ محض حکومت سے بے دخل کرتی ہے

بلکہ بدستوراسی کوشش میں رہتی ہے کہ وہ بے دخل رہیں۔ بچی وجہ ہے کہ ایسی حکومت کے اقدامات و حکمت عملی میں خلوص و دیانت منفق ہوئے ہیں۔ اس کا پیش نہاد استحکام و استمرار حکومت و اقتدار ہوتا ہے۔

مزید برآں حکومت اپنے آپ کو اپنی پارٹی کے سامنے جواب دہ سمجھتی ہے نہ کہ عمومی طور پر ملک کے قوم کے سامنے۔ خود پارٹی میں بیجا بنداری پائی جاتی ہے کہ اس کی منتظم Executive جسے حکومت کا محاسب کہا جاتا ہے اس کے اسقام و عیوب کو چھپاتی ہے وہ چھپاتی ہی نہیں بلکہ انھیں حق بجانب قرار دیتی ہے۔ پارٹی کے نام نہاد محاسبہ کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ پارٹی کے کوئی سرگرم ارکان برسر اقتدار ارکان کی جگہ لینے کے متنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حکومت پر تنقید ایسے ارکان جماعت کی طرف سے شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے حکومتی۔ دفناتی۔ بحران پارٹی افراد کے ادھر ادھر کر دینے سے طے ہو جاتے ہیں۔ محترنین کو جب عہدے میسر آجاتے ہیں تو ان کے اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں۔

پارٹی طرز حکومت میں قوم کا ایک مذموم دوری جو جد میں گرفتار ہو جانا ناگزیر ہے۔ اس نزع کا یہی پھل ہے۔ قوم اس سے اپنی وحدت اور یکسانیت کھو بیٹھتی ہے اور کم از کم تین گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ۱) حکومتی گروہ۔ ۲) پارٹی کی منتظم Executive ۳) مخالف پارٹی یا پارٹیاں۔ ان کے باہمی رشتہ پر عمومی تبصرہ بطور بالا میں ہو چکا ہے۔

حزب مخالف کے وجود سے ایک لحاظ سے بزم سیاست میں ہماہمی اور رونق رہتی ہے، کیونکہ مخالف پارٹی اپنی تنظیم اور مد مقابل کی تخریب میں لگی رہتی ہے اور اس ضمن میں رہتی ہے کہ وہ بھی کافی قوت مجتمع کر کے حکومت بن سکے گی۔ لیکن اگر مخالف جماعت کو خارج از بحث کر دیا جائے تو یہ رونق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جو افراد حکومت میں شریک نہیں ہوں گے وہ اپنے آپ کو حکومت سے غیر متعلق سمجھیں گے اور اس سے دور ہوتے جائیں گے۔ چونکہ حکومت کے کاروبار میں شریک ہونے یا اس پر اثر انداز ہونے کی شرط پارٹی کی رکنیت ہے جو انھیں کسی وجہ سے منظور نہیں اس لئے حکومت میں ان کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ ان افراد میں کے ذی علم یا تو مشرعی (Cynic) بن جائیں گے یا باغی۔

ان گذارشات کی روشنی میں پاکستان کے انتخابات تو کا تصور بے کیف اور بے روح ہو جاتا ہے میدان انتخاب میں ایک مسلم لیگ ہوگی۔ لیگ عالمہ یا منظمہ ہر حلقے میں اپنے امیدوار نامزد کر دے گی۔ کوئی منظم جماعت اس کی حریف نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر بعض حلقوں میں بعض من چلے مقامی تعصبات کی بنا پر مسلم لیگ امیدواروں کی مخالفت کریں۔ جہاں کہیں بھی کسی نے ایسا کیا وہ مقامی تعصب پر ہی حریف کو چھپاڑنے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ سیاسی جماعت کی تشکیل نہیں کر سکتے اور اپنا کوئی بلند عمومی سیاسی پیش نہاد نہیں رکھ سکتے۔ مقامی تعصبات میں نسلی یا خاندانی عنصر غالب ترین ہوگا۔ یہ عوامل اب متروک ہو چکے ہیں۔ دنیا ان سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب یہ گڑھے مڑے اکھیرے نہیں جاسکتے۔ ان کو اکھیرا بھی نہیں جانا چاہئے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دیہات میں یہ تنگ دائرے اپنا اثر کھو چکے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اب انھیں از سر نو تقویت نہیں پہنچائی جاسکتی۔ تو پھر کیوں نہ بلند تر مقاصد سے دلچسپی پیدا کی جائے اور اسی فضا پیدا نہ ہونے دی جائے جس سے ایسا احتمال بھی پیدا ہو۔ کیوں نہ ہم خاندان اور نسل کے بتوں کو توڑ کر ملت سے اعتصام و تمسک کریں کہ تو یہ انسان ایک وحدت ہے اور ناقابل تقسیم۔ پھر حال ایشوع کچھ بھی ہو مسلم لیگ کی مخالفت حقیر اور ناقابل اعتنا ہوگی۔ ایسے میں انتخابات کس قسم کے ہوں گے؟ بس یہ کہ عالمہ نے کس کو نامزد کر دیا اور حریف کی عدم موجودگی میں وہ بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا۔ اگر ایسا ہے۔ اور ان حالات میں ایسا ہی ہوگا۔ تو پھر سیاسی انتخابات و تشکیل حکومت ایک مذاق بن کے رہ جائیں گے۔ کیا محض ایک سیاسی پارٹی کو یہ دائمی حق نہیں مل جائے گا کہ وہ مانی کا لوائی کرے اور خواہی نہ خواہی حکومت پر مسلط رہے؟ ہر قوت کا نشہ خطرناک ہوتا ہے اور مطلق قوت کا نشہ خطرناک ترین ہوتا ہے۔

مسلم لیگ کے متعلق یہ اہم حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ قبل از تقسیم ہند اور بعد از تقسیم کی مسلم لیگ میں بڑا فرق ہے۔ تقسیم سے پیشتر مسلم لیگ اور ملت میں کوئی فرق نہیں تھا اور ملت ہمہ تن مسلم لیگ سے وابستہ تھی۔ لیکن مسلم لیگ کے حکومت سنبھالنے یعنی ہندوستان میں عارضی حکومت میں شریک ہوجانے اور پھر پاکستان میں مکمل حکومت بن جانے سے ملت کی رائے بدل گئی ہے اور اب ملت کی

مسلم لیگ سے وابستگی دینی نہیں رہی جیسی پہلے تھی۔ طلوع اسلام میں متعدد مرتبہ اس ضد کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے جو حکومت اور ملت کے مابین واقع ہو چکا ہے اور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس بُعد و مغائرت کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ ملت اپنے آپ کو شریک حکومت نہیں سمجھتی وہ تجربہ سے اس ناقابل تردید نتیجہ تک پہنچ چکی ہے کہ حکومت اس کی اپنی نہیں۔

محترم قائد اعظم کی جس تقریر کا حوالہ ہم نے آغاز کلام میں دیا ہے اسی میں انھوں نے یہ بھی فرمایا۔ یہ حکومت مختلف ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ حکومت نذیر کی ہے، نذیر کی۔ یہ حکومت آپ کی ہے۔

موجودہ حکومت زید و بکر کی ہو یا نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ یہ مسلم لیگ کی حکومت ہے۔ مسلم لیگ اپنا بہت سا اعتماد کھو چکی ہے۔ اب وہ اتنی ہر دلعزیز نہیں رہی جتنی کہ ہو ا کرتی تھی۔ اسے دوبارہ ہر دلعزیز اور واحد نمائندہ جماعت بنانے کا یہ طریقہ کہ دیگر جماعتوں کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے یا ان کو مطلوبہ مراعات دی جائیں، غیر آئینی اور غیر جمہوری ہے۔ ہم ایمر جنسی کے ڈر سے ایک ایسی طرز حکومت کو رائج بلکہ مسلط کر رہے ہیں جو ملت کو ایک مصیبت سے نکال کر دوسری مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔ اس پارٹی آمریت کا نتیجہ ہمہ گیر بد نظمی اور فوفویت (Anarchy) کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ قوم کا قابل قدر طبقہ اپنے آپ کو ناخواندہ سمجھنے پر مجبور ہوگا اور قوم ان کی ذہنی اور قلبی متاع سے محروم رہ جائے گی۔

ہم بد قسمتی سے ایک دوری استدلال کا شکار ہیں جاں علت و معلول میں امتیاز شکل ہے۔ کیونکہ ہر معلول دوسرے نتیجہ کی علت ہے۔ ہمیں اس سے نکل کر مراد مستقیم کی طرف آنا چاہئے کہ قومی اہلکے صحیح اظہار کی یہی صورت ہے۔ ہم چند افراد کے انا کے اظہار کی سبیل نو پیدا کر رہے ہیں لیکن اجتماعی انا کو جو بس و مقید کر رہے ہیں۔ یہ مراد مستقیم وہی ہے جس کا خاکہ ہم سابقہ اشاعت میں پیش کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ کوئی سیاسی جماعت نہ ہو اور ملت کے تمام افراد ایک دوسرے کے ممد و معاون بن کر تشکیل حکومت کریں۔ کوئی ایک فرد ہی اس نظام سے خارج نہ ہو۔ وہ اپنی امکانی قدرت کے مطابق نظام میں شریک ہو اور نظام اس کا ضامن ہو کہ اس کے انا کے کماحقہ اظہار کے مواقع ہیا کئے جائیں گے۔

ہم نے جو کچھ سابقہ اشاعت میں لکھا تھا اور جسے اوپر دہرایا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ ہمارے ارباب حل و عقد کا ارشاد ہے کہ مختلف پارٹیوں کا وجود ملک پاکستان کے لئے سخت خطرناک ہوگا۔ بالکل بجا اور درست۔ لیکن وہ اس کا علاج کیا بتاتے ہیں؟ یہ کہ ان کی اپنی پارٹی (مسلم لیگ) موجود رہے اور باقی اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی بننے نہ پائے اور اگر بن جائے تو باقی نہ رکھی جائے۔ محترمین کا اعتراض یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس کون سی آسانی سند ہے کہ اس کا وجود ضرور ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی نہ رہے۔ آپ غور کیجئے تو دنیا میں پارٹی بازی اور گروہ بندی کی بنیاد ہی اس غلط اصول پر ہے کہ ایک پارٹی یہ چاہتی ہے کہ میرا وجود ضرور ہے، لیکن کوئی دوسری پارٹی میرے مد مقابل نہ آئے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور دوسری کوئی پارٹی حق پر نہیں۔ لیکن آپ سوچئے تو بعینہ یہی دلیل اس پارٹی کے مد مقابل دوسری پارٹی سے رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طرح بیسوں پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں اور ایک دوسرے کی ضد قائم رہتی ہے، غور کیجئے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنے کا یہ طریق نہیں کہ آپ اپنی پارٹی کو برسر حق قرار دے کر اس کے وجود کو قائم رکھیں اور باقی پارٹیوں کو باطل ٹھہرا کر ان کا استیصال کرنے لگیں۔ اس طرح سے پارٹیوں کا وجود کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کے ختم کرنے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ وہی طریق ہے جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ کہ کسی پارٹی کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ جب پارٹیاں ختم ہو جائیں گی تو باقی ملت رہ جائے گی۔ جس طرح 'جب قرآن ختم ہو جائے گا تو باقی مسلمان رہ جائیں گے۔ اور آگے بڑھے تو۔۔۔ جب تو میں ختم ہو جائیں گی تو باقی انسانیت رہ جائے گی۔۔۔ یہی قرآن کا مقصد ہے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے اس دعوے کا توڑ کہ مسلم لیگ، ملت کی نمائندہ جماعت ہے، خان عبدالغفار نے کیا تجویز کیا ہے۔ اس نے اپنی مجوزہ جماعت کا نام (Peoples Party) کے بجائے Peoples Organisation رکھ لیا ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کی پارٹی ملت کی نمائندہ ہے۔ اس کا دعویٰ ہوگا کہ اس کی پارٹی ملت کی نمائندہ ہے۔ قول فیصل شاید اراکین کی تعداد قرار پاجائے۔ اس باب میں جو زیادہ جدوجہد کرے وہی کامیاب ہو جائے گا۔ اور پھر معاملہ میں تک تھوڑا

رہ جائے گا۔ بیسویں پارٹیاں وجود میں آئیں گی اور ہر ایک کا یہی دعویٰ ہوگا کہ

آد لوگو کہ ہمیں نور خدا پاؤ گے

پھر ہر پارٹی کا اپنا اپنا عسکری بازو بھی ہوگا۔ خان عبدالغفار خاں کی تجویز ہے کہ ان کے سرخپوشوں کی تحریک تمام پاکستان کو محیط ہو جائے۔ آپ مسلم لیگ کے رضا کاروں کو ہمہ گیر بنانے کی کوشش کریں گے یہ دونوں کوششیں محض پارٹی بازی کی جنگ ہوگی حالانکہ اب نہ سرخپوشوں کی ضرورت باقی ہے نہ مسلم لیگ کے رضا کاروں کی۔ اب صرف پاکستان کی سپاہ کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ تنخواہ دار ہو یا رضا کار۔ اور بس۔

اس حقیقت کو بھی ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے جسے ہم نے سابقہ اشاعت میں پیش کیا تھا کہ مسلم لیگ بہت زور مارے گی تو دس لاکھ ممبر بھرتی کر لے گی۔ پچاس لاکھ کر لے گی۔ لیکن پاکستان کی مجموعی آبادی کے مقابلہ میں یہ جماعت بہر حال اقلیت کی حیثیت رکھے گی۔ اب جو حکومت بنے گی تو اس اقلیت کی بنے گی۔ اکثریت اپنے آپ کو حکومت سے الگ تصور کرے گی۔ وہ یا عضو معطل بن کر بیٹھ جائے گی یا مقابلہ میں دوسری پارٹیاں بنانے میں مصروف ہو جائے گی۔ دونوں صورتیں قوم کے لئے خطرناک ہوں گی۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر اب مسلم لیگ کو چونکہ لیگ کی مقبولیت پر یقین ہے اور اس لئے اپنی حکومت کی تشکیل کے امکانات پر اعتماد اس لئے وہ ہماری اس تجویز کو درخور اعتنا نہیں سمجھیں گے۔ لیکن ہم ان سے بادب گذارش کریں گے کہ وہ اپنی عارضی حکومت کے امکانات ہی کو سامنے نہ رکھیں، استحکام مملکت اور تعمیر ملت کے بلند ترین مقاصد کو بھی پیش نظر رکھیں اور اس کی یہی صورت ہے کہ

تو اسے شرمندہ ساحل اجیل کر بکراں ہوجا

پارٹیوں کو توڑ کر جذبہ ملت کر دیجئے۔ اجزا کو گل میں سو دیجئے۔ افراد کو کارواں تہوں کو صہلا اور قطروں کو دریا میں تبدیل کر دیجئے۔ یہ کیفیت پیدا کر دیجئے کہ

ایک ہوں سارے حرم کی پاسبانی کے لئے

اور پھر دیکھئے کہ آپ کی ملت کس طرح حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہو کر فضا ئے عالم کی مہمہ گیر بہتائیوں پر چھا جاتی ہے۔ اس کا عمل طریق بھی وہی ہے، جس کا ذکر ہم نے سابقہ اشاعت میں کیا تھا۔ یعنی پاکستان کی تمام آبادی کو ابتدائی وحدتوں (Primary Units) میں بانٹ دیجئے۔ ہر وحدت (وہ دس کی ہو یا سو کی) بجائے خویش ایک مملکت اور حکومت ہو۔ اپنے اپنے حلقہ کے راعی۔ ایک دوسرے کے رفیق و معاون۔ ہر ایک کی استعداد و استطاعت سے باخبر۔ تمام کے تمام ایک نصب العین کے حصول میں منہمک۔ ہر فرد ایک مہمہ گیر نکل کا جیر لائیونگ ہونے کی جہت سے نکل کے مدوجز میں برابر کا شریک اور اس طرح

دل ہر قطرہ ہے سازا نا البھر

کی زندہ تصویر۔ یہ ابتدائی وحدتیں پھیلیں تو پوری مملکت پاکستان بن جائیں اور ساری کی ساری مملکت پاکستان سمٹے تو ہر وحدت میں اس طرح مرقم ہو جائے جیسے آنکھ کے تلی میں آسمان۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو جو شخص اس وحدت کو توڑ کر پارٹی سازی کا خیال بھی دل میں لائے اسے "شُرک فی الملت" کے جرم عظیم کے سزا میں کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔

یہ ہے صحیح طریقہ پاکستان سے پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنے کا۔ اور یہی ہے طریقہ ملت کے ہر فرد کو عملاً محسوس کرانے کا کہ اب حکومت کسی اور کی نہیں، اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہر سمجھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ

دیو استبداد جمہوری قبائیں پائے کو ب
تو سمجھا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پر ی!

قرآنی تعلیم

(علامہ اسلم جیراچوری مدظلہ العالی)

طلوعِ اسلام کے گزشتہ پرچہ میں میں نے لکھا تھا کہ ملتِ اسلامیہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی خلافت قائم کرے۔ لیکن یہ اجالی اشارہ تھا جس میں اس کی وضاحت نہیں تھی کہ کیوں خلافت قائم کرنا فرض ہے اور کس طرح یہ خلافت قائم کی جاسکتی ہے اس لئے اس کی تفصیل بیان کرنی ضروری ہے۔ اس بات کو ہر مسلمان جانتا بلکہ دل سے مانتا ہے کہ اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ توحید کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے واحد بلکہ یہ بھی ہے کہ صرف وہی حاکم ہے اور صرف اسی کی اطاعت امت کا فریضہ ہے۔ جس طرح اس کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک ماننا شرک ہے اسی طرح اس کے سوا کسی کو حاکم ماننا یا کسی کی اطاعت کرنا بھی اس کی توحید کے خلاف ہے۔

خلافت راشدہ تک اللہ ہی کی حکومت اور اسی کی اطاعت رہی۔ ان خلفاء کرام میں سے کسی نے بھی اپنی اطاعت نہیں چاہی بلکہ امت سے اللہ ہی کی اطاعت لیتے رہے۔ اور ان کے زمانوں میں ساری ملت اعتقاداً اور عملاً سچی موحد تھی۔ لیکن ان کے بعد جو لوگ سر پر آئے خلافت ہوئے ان کے شخصی اور خاندانی اغراض بھی حکومت میں شامل ہو گئے جن کو پورا کرتے کے لئے انھوں نے بیت المال اور فوج پر اپنا قبضہ جا کر آزاد مسلمانوں کو اپنی رعایا بنا لیا جس سے حکومت الہی انسانی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔

خليفة جو رسول کا جانشین تھا اس کا فریضہ ملت کے دین اور دنیا دونوں کی قیادت اور رہنمائی تھی۔ لیکن ان مستبد خلفاء نے سوائے حضرت عمر بن عبد العزیز کے خزانہ اور لشکر کو اپنے اقتدار کے لئے

کافی سمجھا اور دینی قیادت علماء کے لئے چھوڑ دی۔ اس طرح ملت کی دنیاوی سیاست اور دینی قیادت جن کا مرکز ایک تھا اب الگ الگ حصول میں تقسیم ہو گئی اور اس میں لامرکزیت آ گئی۔

یہ خلفاء سلطنت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اپنے خاندان بلکہ اپنی اولاد میں محدود رکھنے کی کوشش میں لگ گئے اور وہ حکومت الٰہی جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں سکھایا اور رسول نے اپنے عمل سے اس کو قائم کر کے دکھایا اور خلفاء راشدین نے اسی مہناج پر حکومت الٰہی کو چلا کر ملت کو بام عروج تک پہنچایا انسانی حکومت بن گئی جس کی بنیاد دنیا کی اور قوموں کی سلطنتوں کی طرح قوت اور تغلب پر تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلاصہ اللہ کی اطاعت سے ملت کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

قوت اور تغلب ایسی چیزیں ہیں جن کو دوسرے لوگ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور مسلمانوں کے جس جس خاندان یا جماعت یا قوم نے قوت پیدا کی حکومت کے اقتدار کے لئے اس کو استعمال کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے خود مسلمانوں میں جن میں باہمی خوریزی سخت حرام ہے آپس میں جنگ و پیکار کا ایک لاشناہی سلسلہ چھڑ گیا یہاں تک کہ تمام امت چھوٹی چھوٹی حکومتوں اور سلطنتوں میں منقسم ہو گئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ آخر میں غیر مسلم اقوام نے بھی جب قوت پیدا کی تو یہ جزوی اسلامی حکومتیں ان کا مقابلہ نہ کر سکیں اور ملت کا بڑا حصہ مشرق سے مغرب تک خوار و زبوں اور ذلیل و رسوا ہو کر کفار کی حکومت میں آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب حکومت الٰہی جاتی رہی اور ملت انسانوں کی محکوم اور مطیع ہو گئی اس وقت سے اجتماعی اسلام ختم ہو گیا اور صرف انفرادی اسلام باقی رہ گیا۔

دوسری طرف علماء جن کے حصہ میں ملت کی قیادت آئی وہ بھی اس کی تفریق میں مسلم سلاطین سے پیچھے نہیں رہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ مختلف دیار و اصصار میں تھے اور ہر ایک کا طریقہ فکر الگ الگ تھا۔ اس وجہ سے ان کے اقوال میں اختلافات ہوئے۔ ان اختلافات کے رفع کرنے کے لئے کوئی مرکز نہ تھا اس لئے انہوں نے سند کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مرکز بنا کر روایات کا سلسلہ جاری کیا۔

حیرت یہ ہے کہ کیونکر ان کے ضمیر نے ان کو اجازت دی کہ ان روایات کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ پانچ اور چھ چھ بلکہ اور بھی زائد واسطوں سے ان تک پہنچی تھیں دینی حجت بلکہ قرآن کے برابر مان لیں۔

ان روایات کی بلا استثنا صورت ہے کہ میں نے مزید سے اس کو خبر دی تھی عمرو نے اس نے سنا تھا کبر سے اس سے کہا تھا خالد نے اس سے بیان کیا تھا اصغر نے اس نے سنا تھا اکبر سے الخ۔ ایسی خبر۔ درخبر۔ درخبر۔ درخبر۔ درخبر۔ یہ تو علم ہے نہ شہادت ہے۔ اور کوئی علمی یا عقلی دلیل اس کے یقینی ہونے پر قائم ہی نہیں کی جاسکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے رواۃ جانچے ہوئے تھے اور سچے لوگ تھے۔ لیکن یہ ان کا اعتبار بھی سننا یا ہوا ہے۔ پھر ان کو مستبران بھی یا جانے تو کیا انسانی سہو و خطا عقلی و غلط فہمی و نسبان و ذہول سے بھی وہ بری تھے؟ ایسی صورت میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ مستبر لوگ تھے تو ممکن ہے کہ ان کی روایتیں صحیح ہوں گی۔ یقین کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ بلکہ ان کے مان لینے میں یہ خطر ہے کہ ان میں سے کچھ حدیثوں کے متعلق قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرمادیں کہ یہ میرا قول نہ تھا۔ یا میں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے۔ یا میرے کہنے کا یہ مطلب نہ تھا۔ پھر کون ہے جو جواب دینے کی جرأت کرے گا اور پکڑ پکڑ کے ان کے راویوں کو لائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تم کو حکم دیا تھا۔

وَلَا تَقْعُ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْبَصِرَةِ وَالْعَوَادِ كُلِّ أَلْسِنَةٍ
كَانَ عِنْدَهُ مَسْنُورَةٌ

اس کے پیچھے نہ چل جس کا تھکوکو علم نہیں۔ کیونکہ سب اور بصیر اور قلب ہر ایک سے اس کی بابت سوال کیا جائے گا۔

پھر تم نے ان غیر یقینی روایتوں کو کیوں دین بنا لیا جس کی بنیاد صرف سماعت پر ہے اور بصیر اور قلب کی شہادت منقوض ہے۔ کیونکہ انہم نے ان کے راویوں کو دیکھا نہ ان کے ادویا ان کی روایتوں پر میں نے تم کو ایمان لانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت اللہ اور رسول کے سامنے جواب دہی کتنی مشکل ہوگی اس کا اندازہ سرخص کر سکتا ہے۔
الغرض ان غیر یقینی باتوں کو حجت دینی قرار دے کر ان علمائے قرآن پر جو نو مسلمین اور مکمل کتاب ہے صحابہ و اہل بیت اور اس کو روایات میں دفن کر دیا۔ یہاں تک کہ روایات سے آیات کو منسوخ بھی کرنے لگے۔ پھر زیادہ تر ان میں روایات سے قیاس کو کے مسائل استنباط کئے اور فقہیں مرتب کیں۔ یہ فقہیں بھی جمہوری

نہیں بلکہ شخصی ہیں۔ ائمہ فقہ کے الگ الگ درس تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ مسائل مرتب کئے۔ اس طرح فقہیں بھی الگ الگ ہو گئیں، اور امت ٹولہوں میں بٹ گئی۔

الغرض حدیثوں نے بھی امت میں تفرقے پیدا کئے اور فقہیں بھی تشتت کا باعث ہوئیں۔ اگر خلیفہ وقت ملت کا دینی مرکز بھی ہوتا تو یہ انفرق اس میں نہ پیدا ہوتا۔ کیونکہ نہ اس قسم کی روایت در روایت در روایت حدیثیں بنتیں نہ شخصی فقہیں کوئی قیمت حاصل کرتیں۔ بلکہ قرآن سے استنباط کر کے صرف ایک جمہوری فقہ بنتی جس میں زمانہ کی ضروریات کے مطابق اصلاحیں اور ترمیمیں ہوتی رہتیں۔ اب وہ ملت جس کو اللہ نے تعلیم دی تھی کہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

سب کے سب اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور جدا جدا فرقے نہ بناؤ۔

دنیاوی لحاظ سے سینکڑوں سیاسی منطوقوں میں بٹی ہوئی ہے اور دینی لحاظ سے سینکڑوں فرقوں میں تقسیم ہو۔ جس کے ذمہ دار دو ہی طبقات ہیں۔ سلاطین، ملوک، امرا اور حکام۔ اور علماء و فقہاء و ملا و پیر۔ انھیں دونوں طبقوں نے ملت کو اپنا مطیع بنایا اور قرآن کو علماً اور عملاً متروک و مہجور کر دیا۔

اس لئے ملت کی اس وقت سب سے اہم ضرورت یہی ہے کہ وہ خلافت قائم کر کے پھر اپنا دینی اور دنیاوی مرکز ایک بنائے جس کی قیادت اور رہنمائی صرف قرآن مجید کی روشنی میں ہو سکے اور سارے دنیاوی اختلافات اور دینی تفرقے مٹ جائیں۔

امت کو ایک مرکز پر لانے کا احساس اکثر اسلامی ممالک کے مفکرین میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مصر میں انجمن اخوان المسلمین اور پاکستان میں رابطۃ العالم الاسلامی وغیرہ اسی مقصد کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن ان کا طریق کار غلط ہے۔ اس کے لئے قرآن کا سکھایا بلکہ بنایا ہوا ایک ہی راستہ ہے اور وہ حج ہے۔ اس رکن کو ائمہ نے دکھا ہی اس لئے ہے کہ موصدوں کی امت میں جو مفاہد پیدا ہوں اس کے ذریعہ سے ان کی اصلاح ہوتی رہے۔ ایسی مقدس بین الاقوامی انجمن دنیا میں کسی قوم کے پاس نہیں ہے۔

کعبہ توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موصدوں کے پیشوا

اعظم ہیں۔ انھوں نے بحکم الہی اُس وقت اس گھر کو بنایا جبکہ دنیا میں کہیں کوئی گھر خالص اللہ کی عبادت کے لئے نہ تھا۔ اللہ نے اس گھر کو برکت عطا کی اور سرچشمہ ہدایت بنایا جیسا کہ قرآن میں ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَيْتَةِ مَبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ .

پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور دنیا جہان کی ہدایت کے لئے ہے۔

جب یہ گھر تیار ہو گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ حج کے لئے یہاں آیا کریں۔

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے۔ وہ تیرے پاس پیادہ اور لاغر سواروں پر جو دور دراز سے

آئی ہیں آئیں گے۔ تاکہ اپنے فائدوں کے لئے ان موجود ہوں۔

صرف دو مختصر لفظوں "لیشہدوا مَنَافِعَ لَهُمْ" میں حج کی غرض بیان کر دی۔ یعنی اپنے فائدوں کے لئے لوگ یہاں آئیں۔ یہ فائدے عام ہیں۔ دینی، دنیاوی، سیاسی، ملکی، علمی، عقلی، اور تجارتی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں۔

اسی دن سے کعبہ موجودوں کا بین الاقوامی مرکز ہے۔ قائم النبیین کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے جملہ ملت اسلامیہ کا قبلہ نماز بھی اسی کو بنایا۔

آج حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کو کم دہیش چار ہزار سال ہو گئے ہیں۔ حج کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور ہر سال دنیا کے ہر گوشہ سے محدود دریاؤں کو عبور اور پہاڑوں اور میاںوں کو قطع کرتے ہوئے اس مرکز میں تاج معین پر آکر جمع ہوتے ہیں اور فریضہ حج بجالاتے ہیں۔

اللہ نے قرآن میں نہ صرف اس مکان بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے۔

جَعَلَ اللَّهُ الْكعبةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ الَّذِي فِيهِ لِلنَّاسِ وَالشُّعْرَاءِ الْحَرَامَ وَالْهُدًى وَالْقَلِيدَ .

اللہ نے عزت دلے گھر کعبہ کو لوگوں کے . . . ہمارے قرار دیا۔ اور ماہ حرام کو بھی اور یہی حد قربانی کے جانوروں کو بھی۔

اس آیت میں اللہ نے کعبہ کی مرکزیت کی تصریح فرمادی کہ وہ موجودوں کا بین الاقوامی مرکز ہے جس پر ان کی تمام مصلحتوں کا دار مدار ہے۔ اور جس زمانہ میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ ذی قعدہ - ذی الحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم قرار دیا جن میں ہر قسم کی جنگ و پیکار روک دی جائے گی تاکہ لوگ امن اور فارغ البالی کے ساتھ اس اجتماع میں شریک ہو سکیں۔ قربانی کے جانور اور ذبیحہ کی حیوانیت کی طرف سے دولت مند بندوں پر ان زائرین حرم اور ضیوف الہی کے لئے فرض کئے گئے ہیں ان پر بھی کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ الغرض اس رکن کا مقصد یہ ہے کہ پوری ملت کا اجتماعی مرکز ایک رہے اور اس میں جو خرابیاں واقع ہوں ان کی یہاں سے اصلاح کی جائے اور اس کی فلاح و بہبود کی راہیں نکالی جائیں۔ اسی لئے قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان کیا۔

سَوَاءٌ لِّهٖ الْعَاكِفُ فَيِّرُ وَالْمُبَآئِرُ

اس میں باشندے اور غیر باشندے یکساں ہیں۔

جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا۔ اور وہاں کے کسی باشندہ کا یہ حق نہیں تسلیم کیا کہ وہ اپنے گھر میں قیام کرنے سے کسی باہر سے آنے والے حاجی کو روک سکے۔ بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اگر گرتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔ حج کا طریقہ یہ ہے کہ جس ملک سے لوگ حج کے لئے آئیں اسلامی اصول کے مطابق اپنا اپنا ایک امیر الحج مقرر کر لیں۔ یہ امیر مکہ میں پہنچ کر باہم ملیں۔ تبادلہ خیالات کریں۔ تاکہ ہر اسلامی ملک کی موجودہ حالت اور ضرورت سامنے آجائے۔ پھر انھیں امرا میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے میدان میں مجمع حج میں خطبہ دے جس میں ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرو اور ایک سال کے لئے اجتماعی لائحہ عمل ہو۔

ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لئے نصب فرمایا ہے۔ ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے۔ کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ لوگوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ وہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے تمغوں میں حرارت اور روشنی پہنچتی ہے۔ ان سب کا مغزین میدان عرفات کا منبر ہے جو ان سب سے کہہ تہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب افسردہ، منتشر اور بے نور ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف

نصب مرکزیت ہے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ مرکزی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے جس سے ساری قوم خود بخود منظم ہو جاتی ہے۔ جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہے۔

افراد و جماعتوں یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ قوم کو منظم کرنا چاہتے ہیں ان کو کبھی کامیابی نہ ہوگی کیونکہ یہ الٹا راستہ ہے۔

حج سے فارغ ہو کر حجاج دسویں ذی الحجہ کو منا میں آجاتے ہیں اور یہاں یہ ساری جماعت قرآن کے حکم کے مطابق تین یا کم سے کم دو دن ٹھہرتی ہے۔ اس جگہ مسلم اقوام کو جن کا داعی تعارف ان کے امرا کے ذریعہ سے مکہ میں ہو چکا ہے باہم مل جل کر اور ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کر کے موانست اور الفت پیدا کرنی چاہئے تاکہ آپس میں اخوت کا رشتہ زیادہ مستحکم ہو جائے۔

میں ہر جماعت کے امیر کو اپنے ہمراہوں کو عرفات کا خطبہ اور آئندہ سال کا لائحہ عمل جو وہاں سے ملا ہے اپنی اپنی زبانوں میں سمجھا دینا چاہئے تاکہ جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے وہ عرفات کے منبر کا پیغام اپنے ساتھ لائے۔ اس سے تمام عالم اسلامی میں ایک نئی روح ایک نئی بیداری اور علی وحدت پیدا ہو جائے گی۔ ملت اگر چاہے تو حج کے موسم میں متحدہ کوشش سے مکہ کو یعنی حجاز کو اپنا بین الاقوامی جمہوری مرکز بنا سکتی ہے جس میں ہر اسلامی سلطنت کا ایک ایک نمائندہ شریک ہو۔ اس جمہوریت کا قریضہ یہ ہوگا کہ وہ خالص قرآن کو لیکر تمام اسلامی حکومتوں میں ہم آہنگی اور حکومت الہی کی اطاعت پیدا کرے۔ اور یہی اسلامی خلافت ہوگی۔

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن کی رو سے مکہ اسلام کا مرکز ہے اور ہر قوم کا مرکز ہے۔ لیکن آج تک بجز قبلہ نماز اور جمع حج کے اور کسی قسم کی مرکزیت اس کے حصہ میں نہیں آئی۔ اور اسلامی حکومت کا تو کبھی یہ مرکز بنا ہی نہیں صرف حضرت عبداللہ بن زبیر نے چند سال تک اس کو اپنی خلافت کا مرکز بنایا تھا لیکن وہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی ان سے چھن گئی۔ ممکن ہے کہ اب اللہ تعالیٰ اس بلوک اور سرچشمہ ہدایت شہر کو موحدین کی ایسی مرکزیت عطا فرما دے جو قیامت تک رہے۔

فلسطین

اہل فلسطین خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغازِ تاریخ سے ہی جنگوں سے دوچار رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیرے کو اور روشن کر کے تو فلسطین جنگ و پیکار میں ہی ابھار دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس مختصر سے ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے ذرہ سکا۔ نقشہ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ روشن ہو جائے گا کہ ایسا ناگزیر تھا۔

منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیا تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیا اور جنوب میں

بین الاقوامی جنگا

افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ امریکہ، آسٹریلیا اور شمالی ساحل کے علاوہ سارا افریقہ غیر مساحت شدہ اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع و عریض ارضی حصص کی موجودگی کا لگاں تک بگڑا تھا۔ نقشہ پر یورپ تھا، اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر، اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصہ زمین، انگلستان کے علاقہ ولز کے برابر، فلسطین۔

معلوم دنیا میں قومیں ابحرتی اور ہمتی رہیں۔ چین، ہند، اسپر، بابل، مصر، فارس، یونان، روما! ان اقوام کے عروج و زوال کے لئے باہمی تصادم ناگزیر تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑہ کو بے دردی سے روند ڈالتے رہے۔ اس کے حسیات و مطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دیئے جاتے۔ فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا کہ یہ اس کا حلیف ہو یا

اس کا حریف۔ وہ کس مگے مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانہ میں فلسطین بین الاقوامی تجارتی قافلوں کی گذرگاہ تھا اور جنگ کے زمانہ میں عساکرو جیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعہ باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران میں وہ تباہ ہو جاتا۔ اس کی قومی آزادی و خود مختاری ناقابل حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پر کہ متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تھے فلسطین کسی ایک طرف ہو کر پانسہ پلٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہل فلسطین کی حقیر انداز بھی متعلقہ فریق کا پٹا بھاری کر دیتی۔ لیکن یہ خطرناک اہمیت تھی۔ وہ جرعیف یا حلیف بن کر آسان جنگاہ بن جاتا رہا۔

حضرت یعقوب کا لقب اسرائیل (مرد خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب کے چوتھے

آل اسرائیل

بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ *Juda* میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے انھیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے حضرت یعقوب کا وطن کنعان (فلسطین) تھا لیکن حضرت یوسف نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسف کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے، یہیں بڑھے، پھولے پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعون مصران کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے انھیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ بنی اسرائیل کی کثرت کو روکنے کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں۔ حضرت موسیٰ کہ آل اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اس عالم میں دارالسلطنت میں پیدا ہوئے کہ بنی اسرائیل کے بچوں کی ہلاکت کا انسانیت کش حکم نافذ تھا۔ مشیت ایزدی نے آل اسرائیل کے اس فرزند کو نہ محض ہلاکت سے بچایا بلکہ شاہی معاملات میں

اس کی پرورش کا سامان کر دیا۔ اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں آزاد تربیت کا انتظام۔ وہاں سے لوٹ
انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دی جائے۔ یہودیوں کی
اپنی رعایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسیٰ کے بعد جو شوا کی قیادت میں بنی اسرائیل نے
فلسطین کو بزور شمشیر فتح کیا اور قدیمی باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا۔ جدید مورخین اس نظریہ
کو تسلیم نہیں کرتے کہ قدیمی باشندے بالکل غیرت فانی ہو گئے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر
فتح نہیں ہو سکے بلکہ مغتوحہ علاقہ میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے۔ ایچ۔ جی۔
ویلز نے اپنی کتاب . . . The Outline of History میں لکھا ہے:

یہ ہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین The Promised Land کبھی بھی مکمل طور پر
عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باقلاط واقعات تاسک کو دہرایا گیا ہے۔
ان سے پتہ چلتا ہے کہ Philistines جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمال
میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابل ڈٹے رہے۔

اسرائیلی شہانی اور زرعی عادت کے مالک تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مغتوح (یا ہنوز
غیر مغتوح) پر حملہ کرنا ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو مالکان زمین کو ختم
نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مراد سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی موجودہ خصائل۔ شہروں میں بستیا، ایلات
تجارت میں جہارت وغیرہ۔ ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی سلک دم کی
تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی معمار۔ حضرت سلیمان کے تزک و احتشام
کے باوجود عہد نامہ عتیق کی داستان، مکانات اور محلات کے بجائے، گیہوں، انگور، زیتون، بھڑوں اور
بیلوں کی داستان ہے۔ خدا کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام 'شہان'، (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤد اور سلیمان آل اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر بھی۔ حضرت داؤد نے
پہلی مرتبہ گیارہویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایہ تخت بنایا اور حضرت سلیمان نے دسویں صدی میں
بیت المقدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوج کمال کا زمانہ تھا۔ حضرت سلیمان کے

زمانہ میں ان کی شوکت و ثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت سلیمان کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصہ میں "سلطنت اسرائیل" کا قیام کیا۔ باقی دو یعنی جوڈہ اور بن یامین کے قبائل بدستور جنوب میں تخت داؤد کے وفادار رہے۔

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی مرکزی عبرت انگیز ہے، لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں برپا دی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر برپا دی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلا جرم سزا نہیں تھی۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُضِدََّنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّاتٍ وَ
لَتَعْلَنَّ عَلْوًا كَبِيرًا (سجہ)

اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خریدی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ ان میں سے پہلی تباہی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں ظہور میں آئی۔ کوئی ۷۲۱ ق م میں شمالی فلسطینی حکومت پر آشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے۔ تاریخ ان کے انجام کے معرکے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس حادثہ کے کوئی دو صدی بعد بابل کے شاہ بخت نصر نے "جنوبی حکومت" کو تہ و بالا کر دیا۔ یروشلم کی کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ قتل و غارت گری سلب و نہب کا ایسا جاں گداز مرتع تھا جو تاریخ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت ہی تباہ ہوئی بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ کبھ گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی و محکومی، ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آ سکتی ہیں سب یکجا ہو گئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ یہودیوں کے بابل

کی اسیری کے زمانہ میں ان کے انبیاء ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا، جبکہ ساٹھ سال کے بعد سائرس نے دریائے فرات اور بحر روم کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا اور یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دیدی۔ شاہ اشاہابن فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور سیکل کی از سر نو تعمیر کی بھی اجازت دیدی۔ چنانچہ ۵۳۷ سے ۵۱۵ ق۔م کے دوران میں سیکل پھر تعمیر ہو گیا اور مردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی ہیج زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی یادداشت میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ فارس کے زیر اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی سکندر نے ۳۳۲ ق۔م میں ۳۰۰ پر ضرب کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کا ملامت مسلوب کر لی۔ ۳۲۰ ق۔م میں بطلمیوس Ptolemy نے مصر کے راستے حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں (دوسری بطلمیوسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے حتیٰ کہ ۱۳۷ ق۔م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تہدید شروع ہو گئی جن کا ذکر صحف یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے۔ پاپسی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ ۵۱ ق۔م کے قریب ایک اور یورش میں جس میں ہزار یہودی غلام بنائے گئے اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انھیں باز آفرینی کا ایک اور موقع دیا گیا اور ان میں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے لیکن یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتام حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آ گیا۔ رومیوں نے ۷۰ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بد بخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد آج تک یہ قوم دشت نوائیوں اور صحرائوں میں ذلیل و خوار ہے۔ "قبل مسج" بعد مسج میں لگیا لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ ہوئی۔ ۱۳۵ء میں شاہ ہدین Hadrian نے یروشلم پر قبضہ کیا اور اسے مکمل طور پر غارت کر دیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال کر چاروانگ عالم میں کھیر دیا۔

آئندہ سال یروشلم میں

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہو گئے اور وہیں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمنزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض ابجد فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً قطرہ قطرہ، فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔

ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ، یاد وطن، تھی اور ایک حد تک یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے پہوہ کے لئے مقدّر کر دیا ہے۔ دشمن کی فتوحات اور اپنی شکستیں، تقدیر کے اس لکھے کو مٹانہیں سکتیں۔ یہ آرزوئے 'وطن' مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال Passover کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ آئندہ سال یروشلم میں۔

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساخت ہیں انھوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ تاریخ سے بنے ہیں۔ جب صحراؤں کی خاک چھانسنے کے بعد ارض مقدس و موعودہ میں داخل ہوئے ہیں تو تاریخ کے قابل ذکر ابواب ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھوں لکھے جا چکے تھے۔ انھوں نے نہ کچھ کو ترقی دی نہ تہذیب و تمدن میں ہی کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور بقائے شخص قومی کا دور مختصر اور ناقابل رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے کوئی نہ کوئی غارت گرا پہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی ہے تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ شاہ فارس سائرس نے ہر چند انھیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دیدی، لیکن چونکہ اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا اس لئے کم تعداد میں یہودی واپس آئے اور جو آئے وہی اہلی یہودی نہیں تھے۔ ان کا شخص مٹ چکا تھا اور ذلت و مسکنت کی دائمی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان و مکان کے پاس یہودیوں کے لئے ظلم و استبداد کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ دیگر اقوام کا تختہ مشق بنے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوصف کہ حضرت مسیح یہودی تھے اور ان کے اولیں خواری بھی یہودی تھے، ان کو دشمنان مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشا بنایا گیا۔ یہ عجیب و غریب حقیقت ہے کہ عیسائیت ہی یاد رکھ سکی کہ مسیح کو مصلوب کرنے کے ذمہ دار یہودی تھے۔ وہ یہودہ اسکرپوٹی Judas Iscariot کو تو بلور کھ سکی لیکن خود اپنے بانی حضرت مسیح، جن اور مال کو بھول گئی۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے چنگڑ خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں اور ان کے خلاف نفرت و حسدات پھیلانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے علاوہ کوئی راہ معاش نہیں تھی۔ اسی پرکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انھیں طرح طرح کی جسمانی

ازبتیس پہنچائی گئیں اور بے دردی اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پئیس بنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دیدی گئی۔ یہ قوی سزا اس ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلاب فرانس نے عوام کا نظری مرتبہ بلند کیا اور خیالات و نظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۷۸۹ء یہودیوں کو یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ سو سال میں دس کے علاوہ ہر جگہ ان پر سے پابندی ہٹادی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے، گاڑیوں میں سفر کر سکتے تھے، زمین کے مالک بن سکتے تھے اور دیگر آزاد شہریوں کی طرح آزادی کا کام کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جیسا ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ، نفرت پائی ضرور جاتی ہے۔ ان مراعات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب ال دیار اور بے وطن مارے مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدس تھا اور اس احساس تقدس کا منظر وہ (Passover) کی سالانہ ضیافت تھی جہاں آئندہ سال یروشلم میں "کا لفظی درد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس امید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہودی کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان Temple of Solomon کی از سر نو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدس آرزو مستقل خطرہ ہے۔ ہیکل سلیمان کی بجائے مسجد عمر استوار ہے۔ ایک کی تعمیر دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ سلیمان کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیکل کی مسجد میں 'تبدیلی' نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر بلکہ ان کے نزدیک یہ سلاک مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک تعمیر مسجد غضب ہے۔ وہ اسے برباد کر کے ہیکل کی تعمیر کے متمنی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علت ہے اس نزاع خونیں کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد | حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے عہد میں یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی چارہائی سال بعد ۶۳۲ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس

وقت سے لے کر ۱۹۱۶ء تک کہ جنرل ایلیسی نے ترکوں سے اسے فتح کیا۔ سوائے اسی عرصے کے کہ صلیبیوں نے لاطینی حکومت کا قیام کیا۔ فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں عربی قوت و شوکت ان کی قبائلی عصبیت، ہذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزور ہو چکی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ترک ابھر رہے تھے۔ گیارہویں صدی میں سلجوقی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے اور خلیفہ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا، گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انھوں نے ۱۲۵۶ء تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے ۱۲۵۶ء کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوت مقدس تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یروشلم نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی تاکہ کافر ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد ۱۲۹۹ء میں پاپائیان یورپ نے یروشلم پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت و خون ہوا کہ گھوڑوں کے ہاتھوں سے خون کے چھینٹے اڑاڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ ۱۲۹۹ء میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۲۹۹ء میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قوی کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۲۸۶ء میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پھر کبھی نہ آسکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانیوں کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ان کے بعد ترکان عثمانی اٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہو گئے۔ تھرس، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویانک کو فتح کر لیا۔ ۱۳۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا گیا جس کا الفا ۱۲۹۲ء میں مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں جنرل ایلیسی کے ہاتھوں فلسطین انگریزی قبضہ میں چلا گیا۔ تاریخ کے ان نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں تہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بیچارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہ رہے تھے۔

صیہونیت

انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوائے استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے

فلسطین میں قورسے دیکھی یعنی شریعہ کی۔ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیش نظر یہ ناگزیر تھا۔ تمام قومیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عربوں کی اہمیت اور قبضہ کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہو گئے اور اس طرح نئی آبادیوں کی طرح ڈالی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی مطلقاً کمی نہیں تھی بلکہ مسرفانہ خرچ کیا جاسکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور خیراتوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترک وطن کے لئے تیار نہ تھے، ان کو رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں، زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالمگیر یہودی جدوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فلسطین میں یہودیوں کا تناسب آبادی بشکل پانچ فی صدی تھا جو پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز تک سات فی صدی سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اختتام جنگ پر ۱۹۱۹ء میں یہ تناسب دس فی صدی تھا۔ گویا سرمایہ کے بے تحاشہ استعمال کے باوجود فلسطین اختتام جنگ اول کے وقت مکمل عربی ملک تھا۔ کیونکہ عرب آبادی نوے فی صدی تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ ۱۸۸۱ء میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ دریا آیا۔ یہودی چارو ناچار ان ممالک سے نکل پڑے ان تارکین وطن کی حقیر سی تعداد عازم فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن 'صیہون' Choveve Zion قائم ہوئی جس نے یہودی تارکین وطن کا رخ سوائے فلسطین پھرنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ ۱۸۹۴ء میں ایک آسٹری صحافی Theodor Herzl نے صیہونی سوسائٹی Zionist Society قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی سٹیٹ میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی سٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ ۱۹۰۶ء میں جب برطانوی حکومت نے اگینڈا Uganda کو بطور موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول کر لیا۔ البتہ جب یہ پیشکش صیہونی کانگریس کے سامنے آئی تو اس نے نامعلوم کر دیا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

یہودی استحقاق

فلسطین پر یہودی استحقاق بتایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے ہم نے اوپر یہودی تاریخ کے اس حصہ کا سرسری جائزہ لیا ہے جو فلسطین سے متعلق ہے۔ اس مختصر تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر ایک قلیل مدت کے لئے حکمراں رہے۔ اس زمانہ اقتدار میں ہر چند انہوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں صرف مغلوب کر کے فلسطین سے ختم نہ کر سکے نہ اکھاڑ کر پھینک سکے۔ اس مختصر دور حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلت و مسکنت اور تباہی اور بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کر سکتا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہیں ہو سکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے یا اس جذباتی وابستگی سے جو وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں فلسطین سے ہے۔ تاریخ و سیاست اول الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک کسی قوم کی تحویل میں محض اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عبد ماضی میں وہ اس پر فرماں روا رہ چکی ہے۔ سیاست کا کوئی اصول اس دلیل بے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حق ملکیت کے حق میں دی جاسکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہئے نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمراں رہے ہوں یا کسی اور قوم کے محکوم، وہ فلسطین کے مالک رہے، اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوئے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کسی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے جائز یا بغرض استدلال کہہ لیجئے ناجائز مالک ہیں۔ لیکن عربوں کے حق میں تو یہی کافی ہے کہ وہ اس ملک میں رہے اور اس کے بدستور مالک ہیں۔ ان کے ہاں استقال ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک یہودیوں کی فلسطین سے جذباتی وابستگی اور آئندہ سال یروشلم میں کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسم کہن کے رسمی اعادہ سے زیادہ نہیں۔ اب تک جو یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے ہیں وہ وہ ہیں جنہیں ان کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے، اور جنہیں صیہونی سوسائٹیوں نے مجبور کر کے فلسطین کی جانب بھیجا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترک وطن کر کے فلسطین میں نہیں آجاتے؟

کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہوں نے فلسطین میں پناہ لی کم ایماندار
یہودی ہیں؟ چونکہ ان یہودیوں پر ظلم و تعدی نہیں ہو رہا اس لئے "آئندہ سال یروشلم میں" میں بہرے کے باوجود
اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود اس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودی فلسطین میں
اگر آباد نہیں ہوئے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی مطالبہ نہیں بلکہ خصوصی اغراض و مصالح
سے انہیں مظلومین پر ٹھونسنا جا رہا ہے جو آبائی وطنوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ اس طرح ان
یہودیوں کے لئے اور مصیبت پیدا کی جا رہی ہے۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر بھڑکانا جملہ کے شرابور ہے۔

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرات موسیٰ اور عیسیٰ فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی
اول الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس میں
حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں
کے لئے۔ وہ پیغمبر جنہیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (لہذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں
کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ فلسطین مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ لہذا وہ عربوں کا ہی
نہیں مسلمانان عالم کا مذہبی مرکز ہے۔ اس خاک کا ذرہ ذرہ مقدس ہے کہ وہ عروج و زوال اقوام کی
الہی مشیت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بے نظیر تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ مذہب فلسطین
کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان جنہوں نے اس رشتہ عزیز کو ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھا اور اسے جان و عزت
رکھا اسے ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں
لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دوئم ہوا ہے وہ تاریخ
کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں!

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ لہذا عربوں کی تاریخ
عرب دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گمشدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں
کیا جائے۔ البتہ ربط قائم کرنے کے لئے ہم مختصر آئناہ ابواب پرتائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دور حکومت
میں عالم عرب پر عمومی طوفان چھوڑ چکا گیا۔ ان میں بیداری کے آثار ۱۹۱۷ء سے شروع ہوتے ہیں جبکہ وہابی تحریک

کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا۔ جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دشمن اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث بن گئی تھی اس لئے بتدریج ان میں آزادی خوفاہی کے جذبات بیدار ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ ۱۸۴۰ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقا میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوام یورپ قومی تعصب کے نشہ میں بہت ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۱ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم۔ عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرق ادنیٰ کے امور میں دخل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قوی کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ ہندوستان پر قابض تھا۔ وہ انگلستان سے ہندوستان تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحر روم اور بحر قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے اجمیر (۱۸۳۰) اور تیونس (۱۸۸۱) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرق وسطیٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحر روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگ جان میں اپنے خون پیچے گاڑنے۔ یہ سلسلہ جنگ عالم گیر تک جاری رہا اور ممالک اسلامیہ استعمار فرنگ کا یا براہ راست شکار ہو گئے یا بواسطہ اس کے زیر اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بد نظمیوں اور مغربی قوی کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی 'مرد بیمار' بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافت اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالک اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی جذباتی تھی لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو حاکم ترکوں کے خلاف حقیقی شکایات

تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قوی مغرب کی باہمی رقابت تھی۔ آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا اور ۱۹۱۴ء میں جنگ عمومی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکی جنگ میں جبر منی اور آسٹریا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام (کلاں) یا مالک عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں تک پر تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدباب اشد ضروری تھا۔ کمپن کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فردری ۱۹۱۴ء میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ سے اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

جیسا ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے ترکی حکومت استبدادی ہو چکی تھی۔ عرب اس کے تحت اپنے آپ کو غلام محسوس کر رہے تھے۔ اس احساس نے ان میں قومی شعور پیدا کرنا شروع کر دیا۔ عربوں میں عام طور پر ترکی کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ عرب خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ عربوں میں وہ جذبہ پیدا ہو رہا تھا جو مذہبی نہ تھا بلکہ قومی بغاوت کا تھا۔ نتیجہ سیاسی آزادی اور وحدت عربیہ کا مطالبہ تھا۔ قومی شعور اندر اندر پیدا ہو رہا تھا لیکن کوئی بھی دثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ عرب ترکی کے اعلان جہاد پر لیک نہیں کہیں گے یا وہ اس دعوت کے علی الرغم وحدت عربیہ کی دعوت کو ترجیح دیں گے۔ عرب صدیوں سے قبائلی غصبت کا شکار چلے آئے ہیں۔ کیا اب اس سے بندوبالارہ سکیں گے؟ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکے تھے۔ ان کی سلطنت سیاسی قوت کے دم سے نہیں تھی بلکہ مذہبی جوش کی وجہ سے تھی۔

حسین، شریف مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدت عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ شہزادہ امید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچھ شائریں اور نجد میں سرسبز میگوہن سے مصروف گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا تاکہ اس پر احسان کر کے، حادہ امین میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس حسین، فیصل سے متفرق بھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفسطاط الاحمد جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے کیونکہ وہ

ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھا رہی تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ انگریز ترکوں اور جرمنوں کے ہاتھوں پیہم شکستیں اٹھاتے جا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ عالم عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیر اثر کیا جائے تاکہ انھیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جاسکے۔ ایسے میں رسوائے عالم میکومین مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکومین مصر میں برطانوی باغی فکشر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قزح اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب، عراق، شرق امدن، فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکومین نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حما اور حلب کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ علاقے خالصتاً عربی نہ تھے۔ اس مغرب کی بعد میں یہ توجیہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا خود میکومین نے ایک مرتبہ لندن کانفرنس لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکومین نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آجاتا تھا۔ اگر بغرض استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے۔ ایسی دوہا زکار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی پھر دلیل دی جاتی ہے۔ میکومین نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہذا یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا اس کی عرب آبادی نوے فی صدی تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر مغربی حکومت اور وحدت عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ ایک حلقہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی استعمال کرتا۔ قومیں جائدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حق ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی جذبہ دینا میں اس متروک و مرعوضہ نظریہ کو اساس گفتگو نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ یہ طرز استدلال غمازی کر رہا ہے کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے ادھر

نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے اسی سینیا میں اٹلی کا حق ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انہوں نے چین کے مغرور علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دیکھی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران میں عربی جذبات و وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایمن بی نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آرہے تھے اور ترکی عسکر کا سلسلہ رسد و رسائل درہم بہم ہو رہا تھا۔ ایمن بی کے الفاظ میں عربوں کی امداد بے بہا تھی۔ لائنڈ جارج نے مئی ۱۹۱۹ء میں اعتراف کیا۔

شاہ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جن سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریزوں کو کامیاب و فاتح بنانے میں کیا کیا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تقیاس سے لگائیے۔

ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خرداک خریدنے میں صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کے چپتوں کی ٹائیں بھی بیکنا شروع ہو گئی تھیں۔ . . . (یہ حالت جولائی ۱۹۱۸ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور گڑبگڑ تھے۔ بیکنا شک و شبہ سے میرا ہے کہ جنگ کے دوران میں تین لاکھ شامی فاقوں مر گئے۔ صحیح شمارہ سے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جوبنک دینے گئے جن میں سے بیشتر تندرامل ہو گئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئے۔

(The Arab Awakening)

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی کی دعوتِ جہاد کی کیوں پروا نہ کی؟ لارنس

عربی آزادی کے الفاظ میں

دورانِ جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں کی حکومت خراب

تھی بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے ماضوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جوئی تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسسی شہری۔

بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (لانس کے خطوط)

ترکوں کے استبدادی اور فاسد دورے عربوں میں بہت حد تک جذبات قومیت و آزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہد ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرق وسطیٰ سے ان کو بے دخل کیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیش نظر مشرق وسطیٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریزوں نے یہیں اپنے قدم جانے کی کوشش کی۔ انگریزی وسیع سلطنت کے لئے مشرق وسطیٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریزوں نے کمال فراخ دلی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کرنا تھا اس لئے وعدوں کی معقولیت و عملیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مصیبت میں انگریزوں نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکت جنگ و وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریزوں نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔ میکومہن نے اگست ۱۹۱۵ء میں حسین کو لکھا:

لارڈ کچنر نے جو اعلان ملی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے۔ جس میں ہماری ہمالک عربیہ اور

ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مئی ۱۹۱۶ء میں جبکہ عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے اس وقت برطانیہ

خفیہ معاہدہ

اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ Sykes-Picot Agreement

طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا عربی وفاق کے موید ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے معاہدہ مالک عربیہ کو طفقہ ہائے اثر (برطانوی اور

فرانسیسی میں تقسیم کرنے پر اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا۔ معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں لیکن اس کے علی الرغم فرانس سے ایک طرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا تھا۔ اگر سائیکس پکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمار فرنگ کی یہ بد اخلاقی اور بددیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرہ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مصائب کی کہ ان میں سے اہم تر فلسطین سے علت العلل ہے۔ جب ۱۹۱۷ء میں روس کی مشترکہ حکومت نے اس خفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا تو حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شرانگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزم مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت و استقلال عربیہ کی تشکیل و تقویم کرے گا۔ انگریز کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین سے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ مسات عرب زعمانے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی جس کے جواب میں وزارت خارجہ (برطانیہ) نے *The Declaration to Seven* شائع کیا اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چھپا کر آیا گیا جس میں تحریر تھا۔

مشرق وسطیٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور

فرانس کے پیش نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی *Complete and*

final liberation ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں نیز ایسی

قوی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی۔ برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظام حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے بلکہ وہ ایسی موثر امداد دیں گے جس سے وہ کامیاب بن سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دوسری مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن موتمر اسن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرق اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب ایک بدعت تھی جو جمعیت اقوام نے پیدا کی۔ اس کا عربوں کی طرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا۔ انگریزوں کی طرف سے وعدہ - وعدہ خالص آزادی کا تھا۔ جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق حسین کے بیٹے فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرق اردن اس کے بیٹے عبدالکریم شام فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے مطابق تھے جو جنگ کے دوران میں عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟ کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے مشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے باہر مجبوری امر کی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات و حیات کو ٹھکرایا گیا جس کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے -

فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی تاکہ وہ یسوپوٹیمیا حاصل کر سکے۔ س۔ پ۔ معاہدہ کی رو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو ایلپو، حما، حمص، دمشق اور شرق اردن۔ انتداب کے صدقے میں اکثر و بیشتر حصے اٹھستان اور فرانس نے ہتھ لئے۔ س۔ پ۔ معاہدہ تحدید میں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حق خود مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔

برطانیہ کو چونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی اس لئے اس نے ان سے **اعلان بالفور** زنگارنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔

چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے بالغلط آمیز اور غیر دیاستدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں کہ جس کے سیاسی پس منظر کے ایک پہلو کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی لہجائی ہونئی نظریں مشرق و وسطیٰ پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمنی کے وعدوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے گئے۔ ان منضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ امریکہ کو اپنی طرف ضرور جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریک جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائزمن، صدر سینیٹ ایسوسی ایشن نے ہیا کی۔ کیمیا داں وائزمن نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا۔ جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائزمن نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ اس سب الجھنوں کا حل اعلان بالفور ہے جو نومبر ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا:

ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو نظر استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کرے گی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائیگا جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انھیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔

اعلان بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب و غریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتام جنگ پر نوے فی صدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی یہودی۔ لیکن اس بد قسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گو یا فلسطین میں بیشتر یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت میں تھے، ایسی اقلیت کہ اسے 'غیر یہودی فرقہ' کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جاسکتا تھا۔ اس ساہے اعلان میں 'عرب' کا لفظ تک نہیں۔ اور مدبرین و سیاست داں عربوں کی قسمت کا فیصلہ چکا رہے!

فلسطین کے اولین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض و ممکن چلے آ رہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل ہیں۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فی صدی ہو سکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جاسکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال پیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھر وئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقدس ملک پر تسلط جاسکے؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس وجہ سے جرمنی کا ملک دیا جاسکتا ہے کہ ان کے آباد اجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو بدیں وجہ بخشا جاسکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن سلاف نے فتح کیا تھا؟

بہر کیف اعلان بالغور نے 'قومی وطن' کا وعدہ کیا نہ کہ یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت

اسی نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصہ میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ 'قومی وطن' ایک بالکل نئی اصطلاح تھی، لہذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعین کر دیئے جائے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضکوہ انگیز تصور پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانہیں کو اس حسین مطالبہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ وزیرین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی اسٹیٹ بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالغور نے زبانی اس مجذوب کی بڑکی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین و قانون میں زبانی وعدے حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبط و تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشا و رضامندی کے خلاف مسلط کئے جاسکتے ہیں؟

یہودیوں کا داخلہ فلسطین یقینی طور پر محدود ہونا چاہئے اور فلسطین کو یہودی دولت مشترکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہئے۔

خلاف صیہونیت تحریک

۱۹۱۹ء کے بعد حالات کی رفتار بدلی گئی۔ کیونکہ سہمہ گیر خلاف صیہونیت تحریک پھیل گئی جس سے یہودی کثیر تعداد میں سابقہ وطن توک کر کے فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ ان تارکین وطن یہودیوں کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا تو ان میں سے اکثر یقیناً فلسطین کا رخ نہ کرتے۔ فلسطین یہودی بے وطنی اور غربت کا حل نہیں۔ لیکن صیہونی سوسائٹیوں نے اس مصیبت کا فائدہ اٹھا با اور اس سیلاب کو فلسطین کی جانب پھیر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ہٹلر پر اقتدار آیا تو اس کی نازی جماعت نے قرون وسطیٰ کے مظالم کی یاد تازہ کر دی۔ ہٹلر ہی عالمگیر جنگ میں جرمنی کی شکست کا ذمہ دار بہت حد تک یہودی سازشوں کو قرار دیتا تھا۔ لہذا آئندہ تباہی سے پیشتر وہ اپنے ملک کو ان غداروں سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہٹلر کی فتوحات کے ساتھ ساتھ مخالف صیہونیت تحریک یورپ میں بھی پھیل گئی۔ یہودیوں کے پاس دو ہی صورتیں تھیں۔ جلا وطنی، قید خانے، چنگا خانے، خودکشی — یا فلسطین! چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فلسطین کی یہودی آبادی ۳۰ فی صدی تک پہنچ گئی۔ ان کی تعداد پچھن ہزار سے ۱۹۵۰ء میں پانچ لاکھ اسی ہزار ہو گئی۔ عرب قدرتی طور پر متوحش ہوئے۔ انھیں ڈر ہوا کہ اگر فلسطین کے دروازے بدستور کھلے رہے تو یہودی ایک دن اکثریت میں ہو جائیں گے اور ان کا ملک یہودی ملک ہو جائے گا، یہودیوں نے سرمایہ کے زور سے غریب عربوں کی زمینیں خریدنا شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنی علیحدہ آبادیاں بنا اور بارہے تھے۔ ان کی آمد سے عرب بے دخل اور اقتصادی طور پر یہودیوں کے زیر اثر ہوتے جا رہے تھے۔ یہودیوں کی پشت پر وہ یہودی سرمایہ دار تھے جو افسانوی دولت کے مالک تھے۔ صیہونیت ایک منظم تحریک تھی۔ اس کے مقابلہ میں عرب غیر منظم اور مفلس تھے۔ لہذا ان کے خدشات قدرتی اور حقیقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہودی مظلوم ہیں اور انھیں آبائی گھروں سے نکالا جا رہا ہے اس لئے انھیں اس سہمہ گیر خلاف صیہونیت تحریک کے چنگل سے بچایا جائے اور انھیں فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے۔ یہ دلیل دینے والے فطرت انسانی کے ابتدائی محرکات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ عرب خود سامی النسل ہیں۔ لہذا یہ

نامکن ہے کہ وہ بھی نام نہاد "ایشی سامی" تحریک کے علمبردار بن جائیں۔ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم کئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود آریائی نسل سے تھا اور سامیوں کا دشمن تھا۔ یہودی مظلومین کے نام نہاد ہمدرد اور یہی خواہوں نے جس انداز سے یہودیوں کو فلسطین پر ٹھونسے اس سے "سامی دشمنی" کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ عرب کبھی "سامیوں" (یہودیوں) کے دشمن نہیں تھے۔ وہ اب بھی نہیں۔ انھوں نے بار بار اعلان کیا ہے کہ عرب ممالک میں بسنے والے یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ ان پر یہودی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ فلسطین میں موجود یہودیوں سے اب بھی وہ قراخدا لانا، ابرادرا نہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نے عربوں کے وطن کو خون و آتش کی بازی گاہ بنایا ہے جن کے ہاتھوں عربوں کے مال و دولت کو نقصان پہنچا۔ ان کی جانیں ضائع ہوئیں۔ انھیں عرب کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں کہ یہودیوں نے فلسطین کو نقصان پہنچایا بلکہ وہ اسے اپنی حکومت بنانے کے مذموم عزائم رکھتے ہیں۔ ہمدردان یہود نے یہودیوں کو "سامی دشمنی" کے پورے حلقے سے نکال کر عربی حلقے میں چھونک دیا ہے۔ یورپ میں جو آگ خاموش ہو گئی تھی اسے بحران اسرائیل نے عرب میں روشن کر لیا ہے۔ اب یہودی اپنے ہاتھوں جلائی ہوئی آگ میں جل رہے ہیں۔

انتداب فلسطین | انتداب فلسطین "اسے کلاس" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا اسے نگرانی میں رکھا جائے گا۔ انگریزی یہود نوازی عرب آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کرتی جا رہی تھی۔ اس کی کیا ضمانت تھی کہ یہ سلسلہ اس وقت رکے گا جب فلسطین یہودی بن چکا ہوگا۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا اعراب فلسطین آزاد ہو سکیں گے؟ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے سیلف گورنمنٹ کی طرح ڈالنی چاہی۔ ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز ہوئی جو ہائی کوشنر کی مشاورتی مجلس ہوتی۔ یہودی ہر چند اقلیت میں تھے لیکن ان کے نمائندے برطانوی پارلیمنٹ میں بھی تھے اور برطانوی حکومت میں بھی۔ یہ خفیہ کوشش بھی یہودی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ انگریز نے بانگ دہل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن اس نے اچانک اسے ترک کر دیا۔ عرب کب تک ضبط کرتے معاملات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے صورت حال نازک تر۔ ۱۹۴۷ء میں فلسطین بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع

ہو گئے۔ برطانیہ نے تشدد سے اس آزادی کی رو کو دبانا چاہا۔ عربوں کے ہیجان کی حقیقی وجوہات تھیں اس لئے حکومت کا جبر و تشدد اسے کچل نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے پہلو بدلا اور رائل کمیشن کا قیام کر دیا۔ کمیشن کی تحقیقات کا حاصل یہ تھا کہ انتداب ناقابل عمل ہے۔ کمیشن نے یہ اضطراری حل پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور برطانیہ، یہود اور عربوں کو علیحدہ علیحدہ حصے عطا کر دیئے جائیں۔

انتداب کا مقصد فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرنا تھا مگر برطانیہ نے فلسطین کو آزادی کے بجائے تقسیم کے لئے تیار کیا۔ یہ تقسیم کی پہلی تجویز تھی فلسطین کی تقسیم! پنجاب کے مشکل چار اور سندھ کے کوئی دو اضلاع کے برابر ملک کی تقسیم!! اور تقسیم کیوں؟ اس لئے کہ یہود کے لئے عرب ملک میں قومی وطن قائم ہو سکے! ابتدا قومی وطن سے ہوگی اور انتہا قومی حکومت پر۔ آخر ان حرکات مذہب و جہ سے حاصل؟ فلسطین کی مجموعی آبادی بیس لاکھ ہے اور اس کا رقبہ دس ہزار مربع میل۔ کوئی پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ صحرائی غیر زری زرع ہے۔ اگر یہ سارا علاقہ آبادی کے قابل ہو سکے تو فلسطین کی آبادی دو گنی یعنی چالیس لاکھ۔ یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ہو جائے گی۔ یہ قطعہ زمین یقیناً یہودیوں کے لئے ناکافی ہے۔ دنیا بھر میں یہودی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ اتنا جم غفیر یقیناً اس مختصر سے قطعہ ارض پر نہیں سما سکتا۔ یعنی اگر سارے کا سارا فلسطین یوں یہودیوں کو دے دیا جائے کہ اس میں ایک عرب بھی باقی نہ رہے تو یہی یہودی اس میں نہیں سما سکتے۔ اور جب ایسا ہے کہ ان کی مشکل کا حل فلسطین نہیں ہو سکتا تو سارا زور صرف فلسطین پر صرف کرنے سے فائدہ؟ کیا یہودی ہمدردی کے بہانے سے عربوں کو کچلا جا رہا ہے؟ اور پھر اگر بالفرض یہودی سما سکیں تو برطانیہ اور امریکہ ایسا کرنے یا کرنے والے کون؟ انھیں کس آئین یا کس قانون نے یہ حق دیا ہے؟ اگر وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور نبی نوع انسان کے ہمدرد ہیں تو ان کا ادعا ہے ہمدردی انسان اس وقت کس عار میں جا چھا تھا جب مشرقی پنجاب، دہلی، ممبئی، پٹی اور کشمیر کے بے کس اور نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ اس تاریخ میں فقید المثال قتل عام کی ذرا اتنے انسانوں پر پڑی جو مجموعی طور پر یہودیوں کی دنیا بھر کی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے نہایت تحمل اور خاموشی سے یہ ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا تماشہ دیکھا۔ خود جمعیت اقوام متحدہ خاموش ہے۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ ہاجرین فلاکت زدہ،

لے لٹائے پاکستان پہنچے۔ کسی کو یہ قیامت دیکھ کر خیال نہ آیا کہ ان مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دے دیں یا دنیا کے کسی اور گوشہ میں ہی آباد کر دیں۔ مسئلہ کی نوعیت دونوں حالتوں میں ایک ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مسئلہ زیادہ ہمہ گیر اور وسیع ہے۔

خیر، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انگریز اور امریکہ بڑے شمشیر بہودی سلطنت قائم کر لیں گے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حقیر سی سلطنت کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس مفروضہ سلطنت کے مغرب میں بحر روم ہوگا، شمال، جنوب اور مشرق میں دشمن عرب۔ اتنے بڑے عمند میں یہ معمولی سا جزیرہ کب تک محفوظ رکھ سکیگا اور بالفرض جنگ چھڑ جائے تو اس سلطنت کا کیا حشر ہوگا؟ بہودی سلطنت کا قیام محض عربوں کو ہی دشمن بنانے کے مرادف نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان، جو فلسطین سے وہی ہی مذہبی عقیدت و وابستگی رکھتے ہیں جیسی کہ عربوں کی ہے۔ دشمن بن جائیں گے۔ مسلمانان عالم کی دشمنی کے مقابلے میں تیز تر ہے سلطنت کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ یہ نہایت ہی خسارے کا سودا ہے۔ مسلمانان عالم کی دشمنی محض ایک کثیر گروہ کی دشمنی ہی نہیں بلکہ مسلمان ممالک جزا فیائی اور فوجی نقطہ نگاہ سے نمایاں اہمیت کے مالک ہیں۔ مشرق وسطیٰ کو ہی سمجھئے۔ اقوام مشرق وسطیٰ کا اتحاد بین الاقوامی جنگ میں موثر اور نتیجہ خیز ہوگا۔ مشرق وسطیٰ اور ممالک عربیہ کے تیل کے ذخیرے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ تیسری عالمگیر جنگ کے جو آثار ہو رہے ہوتے جاتے ہیں ان سے آئندہ عسکری صف آرائی صاف طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ روس اور اس کے دست نگر ایک طرف ہوں گے اور امریکہ اور برطانیہ اور ان کے معاون ایک طرف۔ دونوں جانبوں کو مشرق وسطیٰ کے اڈوں اور تیل کی اشد ضرورت ہے۔ دونوں مجبور ہوں گے کہ ان علاقوں اور ان کے باشندوں کو اپنے ساتھ ملائیں۔ دنیا کے اسلام متحد و مرکوز ہو جائے تو وہ متصادم بین الاقوامی قوتی میں توازن پیدا کر سکے گی۔ فلسطین کا مسئلہ اس نوعیت کا ہے کہ اس کے حل پر مسلمانان عالم کی دوستی اور دشمنی کا دارو مدار ہے۔ چنانچہ اگر برطانیہ فلسطین کے معاملہ میں مسلمانوں کی ہمدردی سے محروم ہو گیا تو دنیا میں کہیں بھی اس کے پاؤں جم نہیں سکیں گے۔ مشرق وسطیٰ بلکہ عالم اسلامی، اس کی جنگی مسکات اور اس کی طبعی دولت کے مقابلہ میں ایک مختصر سی بہودی سلطنت ٹھکرائی جاسکتی ہے۔

جہاد حریت

انگریزوں نے ان سب امور کو بالائے طاق رکھا اور یہودی محبت کے جنون میں اپنے مصالح و مفاد کو بھی بھول گیا۔ رائل کمیشن نے جب پہلی مرتبہ تقسیم کا حل پیش کیا تو برطانیہ کے عزائم کا عروج کو اندازہ ہو گیا۔ جنگ کے دوران کے دلفریب الفاظ، جمعیتہ اقوام کے بلند بانگ کاغذی اصول، استبداد کا ادعا، آزادی سب منافقت پر مبنی تھے حقیقت کچھ اور تھی۔ فلسطین میں ہمہ گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب کے یہ مظاہرے ان علاقوں میں خصوصیت سے زیادہ تھے جن کے متعلق تجویز تھی کہ انھیں یہودی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک یعنی آغاز جنگ عالمگیر ثانی تک فلسطین جنگ سے دوچار رہا۔ ایک طرف مخلص اور مفلس عرب تھا جس نے اپنا سب کچھ انگریز کی خاطر قربان کیا، اس امید پر کہ وہ آزادی حاصل کر سکے گا۔ دوسری طرف انگریز تھا جس نے غلامیوں کی آزادی خواہی کو عظیم الشان فریب دے کر انھیں مفت میں خرید لیا تھا۔ سابقہ دوست کا ہاتھ پرانے دوست سے حق دوستی کا تقاضا کر رہا تھا اور پرانا دوست سنگین، توپ، ہوائی جہاز سے اس کے جان و مال سے کھیل رہا تھا۔ اس جہاد حریت کے قائد مفتی اعظم حسینی تھے۔

ڈاکٹر ڈارلڈن نے اپنی کتاب *The Problem of Palestine* میں اس جہاد کا مختصر سا نقشہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

(انگریز کی طرف سے) تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ عرب دیہات پر حملے کئے جاتے ہیں اور حکومت کی فوج انھیں بریاد کر دیتی ہے۔ تعزیری کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ہوائی بمباری، گھروں کو بارود سے اڑا دینا، دیہات کی تباہی، مال دولت کی بریادی، سب شامل ہیں۔ ملک میں حرکت محدود (اور دشوار) ہو گئی ہے اور کرفیو کا راج ہے۔ مشتبہ افراد کو قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بغیر مقدمہ چلائے محسوس رکھا جاتا ہے۔ دوسروں کو جزائر پہلے میں بغیر مقدمہ چلائے بھیج دیا جاتا ہے۔ کئی جیلوں میں مڑ رہے ہیں اور کئی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔

یہ لفظ شیرداستان ہے، ان کے لئے ناقابل برداشت جو برطانیہ، اس کے مدبرین

اور اس کے سپاہیوں کے نام کو عزیز سمجھتے ہیں۔ میں اس پر اس سے زیادہ رائے زنی نہیں کرونگی کہ آئرلینڈ کے زبانہ Black اور Tans کے بدترین کوائف کو اس ملک میں دہرایا جا رہا ہے جسے سب عیسائی یہودی اور مسلمان مقدس سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس فلسطین کو دیکھا ہے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں، ان کے لئے سرکاری تردیدی بیانات کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انتہائی تشدد بے کار ثابت ہوا ہے اور اس سے منافرت اور بڑھی ہے۔ بارہا عرب مردوں اور عورتوں نے مجھ سے کہا ہے: اگر برطانوی فوج جو میں گھسنے کی چٹی لے لے تو فلسطین میں ایک بھی یہودی زندہ نہ رہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعا نرم ہیں اور جو اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا مزید داخلہ بند کر دیا جائے تو کل امن ہو سکتا ہے۔

عربوں کے جوش و شہینگی کا یہ عالم تھا۔

ایک ما صاحب نے جن کا رنجہ فریضہ یہ تھا کہ وہ ان قیدیوں سے ملیں جنہیں تشدد کے جرم میں موت کی سزا ملی ہے، مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے ایک مجرم کو دیکھا کہ وہ دو زانو ہو کر اشد کاہنزار ہزار شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اسے ملک اور مذہب کی خاطر جان دینے کی عزت عطا کی۔ ایک عرب (عیسائی) عورت نے مجھے بتایا کہ ایسے بیٹے کی ماں سے جب اس نے اظہار تعزیرت کیا تو اس ماں نے اس ہمدردی کو فخر و غرور سے رد کر دیا۔ ایک ماں جس کا بیٹا اشد نے یوں منتخب کیا ہو قابل رحم نہیں قابل عزت ہے۔ (ایضاً)

برطانیہ اپنی طاقت کے زعم میں اپنے جو رواستبدار پر قائم رہا۔ بہار ہوائی جہازوں کے سایہ میں ۱۹۲۵ء میں اس نے وڈسڈ کمیشن Woodhead Commision بریں مقصد فلسطین بھیجا کہ وہ تقسیم کے علی پہلو سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی علت تشکیل تقسیم پر رائے زنی نہیں تھی بلکہ تقسیم کی جزئیات طے کرنا تھی۔ کمیشن کی رپورٹ معلومات سے پُر ہے۔ اس نے سابقہ تجویز سے جس اختلاف کیا اور نئی تحدید پیش کی۔ رپورٹ کے ایک ایک صفحے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے، یہ خاموش لایاں ہے کہ تقسیم ناقابل عمل ہے۔ چنانچہ کمیشن نے مجوزہ اجزائے فلسطین کی تحدید کے لئے فوجی

قوت کی ضرورت پر زور دیا۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ تقسیم کے لئے تلوار ناگزیر ہے۔ تلوار کہاں تک تقسیم کی خیریات طے کر سکتی ہے؟ اس کا جواب کمیشن کے دس سال بعد تک کے واقعات نے بخوبی دیدیا ہے۔ جمعیتہ اقوام متحدہ بھی تقسیم نافذ کرنے سے عاجز آچکی ہے۔

۱۹۴۹ء میں برطانوی حکومت نے عرب اور یہودی زعماء کو مذاکرات کے لئے لندن بلایا۔ برطانیہ کا اعتماد عربوں کے دلوں سے اٹھ

برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی

چکا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک کے پچیس سالوں کے انگریزی-عربی تعلقات افسوسناک داستان کے حامل ہیں۔ اتنی بدعہدیوں اور جوہر و تعدی کے بعد عرب انگلستان کے خلوص نیت کے کیسے قائل ہو سکتے تھے۔ انصوں نے پوری جرأت سے کام لیا اور استقامت سے اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ یہاں سے لگ سکتا ہے کہ انصوں نے یہودیوں کے ساتھ ایک میز کے آس پاس بیٹھ کر مصروف گفتگو ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے مجبوراً جانہن سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی لیکن کوئی مصالحت کی صورت نہ بن سکی۔ برطانیہ نے بالآخر ۱۹۴۹ء کا مشہور قرطاس ابیض شائع کیا جس میں ان کا اپنا حل پیش کیا گیا تھا۔

اس قرطاس کی رو سے یہودیوں کی آئینہ پیمہ پانچ سال تک کے لئے پابندی ہشادی گئی۔ البتہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار سالانہ کی رفتار سے آسکیں گے۔ یعنی وہ کل پچھتر ہزار کی تعداد میں آئیں گے۔ پانچ سال کے بعد مزید آمد عربوں کا رضامندی پر منحصر ہوگی۔ ہائی کشر کو یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن سے یہودی عربوں کی ملوکہ زرعی زمین آسانی سے نہ خرید سکیں۔ بعض مخصوص علاقوں میں یہ خرید و فروخت حکومت فلسطین کی اجازت سے ہو سکے گی۔ دس سال کے بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں فلسطین آزاد ہو جائے گا۔

قرطاس کا مطلب صاف ہے۔ یہودیوں کی تعداد میں مزید پچھتر ہزار کا اضافہ ہوگا۔ فلسطین دس سال کے بعد آزاد عرب حکومت بن جائے گا۔ یہودی اقلیت میں رہیں گے اور عرب حکومت کے شہری بن کر۔ قرطاس ابیض نے تقسیم کو دفن کر دیا اور عربوں کے مطالبات کی صداقت اور بے پناہی کے سامنے برطانیہ کی قوت و شوکت نے ایک حد تک سپر ڈال دی۔ عربوں اور یہودیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم نہ کیا۔ اسی حال میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے زمینوں کی خرید و فروخت

یہودیوں کے داخلہ سے متعلق پابندیوں پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمہ پر یورپی یہودیوں کی آمد کا دباؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ صیہونیت فلسطین پر چھا جانے پر مصر تھی۔ قرطاس ابیض کی رو سے فلسطین کے دروازے بند ہو چکے تھے اور وہ عربوں کی رضامندی ہی سے کھل سکتے تھے۔ ادھر عرب جو پہلے کھبرے کھبرے تھے نہ محض فلسطین کے مسئلہ پر ہی بلکہ دیگر مشترک امور پر بھی متفق و متفق ہو گئے۔ یہ اتحاد و اتفاق ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو عرب لیگ کی باقاعدہ تشکیل میں ظاہر ہوا۔ عرب لیگ کی تشکیل کے بعد فلسطین کا معاملہ مقامی نہیں رہا بلکہ جملہ عالم عرب کا مشترک مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ یوں بھی فلسطین کے مقامی باشندوں کا کب تھا۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانان عالم کا ہے اور تمام عالم اسلامی اس پر متفق ہے۔

انگلستان میں جنگ کے بعد حزب عمال برسر اقتدار آئی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات عامہ سے جونہی پارلیان مرتب ہوئی اس میں سولہ یہودی ارکان تھے۔ خود عمال حکومت میں ایک وزیر اور دو نائب مقرر ہو دیے تھے۔ یہودیوں کو اپنے اس اثر و اقتدار کے باعث یقین تھا کہ وہ فلسطین کا فیصلہ حسب منشا کر سکیں گے۔ لیکن جب وزیر خارجہ برطانیہ نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چکانا چاہا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ قضیہ اتنا آسان نہیں جتنا یہودی شکر کائے اقتدار بتا رہے ہیں۔ ایک طرف یہودی دباؤ تھا اور دوسری طرف مالک عربی کی لیگ کی متفقہ مخالفت۔ یوں اسی فیصلہ پر پہنچا کہ یہ مسئلہ عربوں اور یہودیوں کی باہمی رضامندی سے ہی طے ہو سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ برطانیہ کوئی اقدام کرنا فخر مشہور ہوگی کہ ٹرومین صدر امریکہ برطانیہ سے اپیل کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم اور ایک لاکھ یہودی فلسطین میں فی الفور لے جائیں۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک پچھتر ہزار یہودی توجائز طریقے سے آگئے تھے۔ لیکن ان کی ناجائز آمد کسی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد ایک لاکھ اور تھے۔ جن میں صدر امریکہ خواہی خواہی فلسطین پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ یوں سے ٹرومین نے درخواست کی کہ وہ اس نازک مرحلہ پر ایسی درخواست کر کے مزید الجھاؤ نہ پیدا کرے۔ ٹرومین نے معذوری کا اظہار کیا اور اپیل کر دی۔ اس کی وجہ ۱۹۴۸ء میں ہونے والا صدقاتی انتخاب تھا۔ امریکہ کے پریس اور حکومتی اداروں میں یہود کا بے پناہ اثر و رسوخ ہے۔ انتخابات کے موقع پر مخالف فریقی یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی خوشامی کرتے ہیں۔ بقول شخصے اس موقع پر امریکہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرومین کو

ڈرتھا کہ اس نے یہ اپیل نہ کی تو اس کی حریف ری پبلکن پارٹی ایسا کر دے گی۔ اس صورت میں یہودی ووٹ ٹرومین کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ محض اپنی انتخابی جیت کے لئے امریکہ کی دونوں پارٹیاں فلسطین کو جہنم میں جھونک دینے پر تیار ہیں۔

ٹرومین کی اپیل کے جواب میں برطانیہ نے امریکہ کو دعوت دی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرانا چاہتا ہے تو سٹانچ کی ذمہ داری لے اور یورپ میں یہودیوں کی حالت نیز فلسطین کی صورت حال کی پوری تحقیقات کرے۔ ٹرومین نے جھپکتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس پر ایک مشترکہ انگلستانی۔ امریکی کمیشن مرتب ہوا۔ جسے ہدایت دی گئی کہ وہ چار مہینوں کے اندر راندر رپورٹ پیش کر دے۔ کمیشن کی متعلقہ سفارشات ظاہر ہے کہ نہ عربوں کو مطمئن کر سکتی تھیں نہ یہودیوں کو۔ لیکن رپورٹ عربی مطالبات کی بے پناہی کا مزید اعتراف تھا۔ کمیشن نے ٹرومین کا مطالبہ من و عن تسلیم کر لیا کہ ایک لاکھ یہودی فوراً فلسطین میں داخل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، امریکہ اور دیگر حکومتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ بے وطن یہودیوں کے لئے یورپ میں کسی جگہ نئے گھر تلاش کریں اور اس ضمن میں فوری اقدام کریں۔ کمیشن نے نہ تو فلسطین کی آزادی کی سفارش کی، نہ عرب حکومت کی، نہ یہودی حکومت کی، بلکہ ایسی دو قومی حکومت کا مشورہ دیا جس میں عرب اور یہودی مساوی حقوق شہریت کے مالک ہوں۔ مزید رائے یہ تھی کہ فلسطین کو غیر معین عرصہ کے لئے استبداد سے نکال کر قومیت میں رکھ دینا چاہئے۔ زمینوں کی موجود پابندیوں کی منسوخ کی رائے دیتے ہوئے کمیشن نے ایسی تجاویز پیش کیں جن سے عرب کسانوں وغیرہ کے اس ضمن میں حقوق کی نگہداشت مقصود تھی۔ آخری سفارش یہ تھی کہ جانبین کے تشدد کو سختی سے دبا یا جائے۔

ایک دفعہ بھر ثابت کر دینے کے علاوہ کہ تقسیم فلسطین ناقابل عمل اور ناممکن ہے معاملہ آگے نہ بڑھایا جاسکا۔

انستادب عملاً برطانیہ کے لئے ایک ہنگامہ سودا ہو گیا تھا۔ وہ دیا تدارکی سے فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرتا تو مسئلہ فلسطین پیدا ہی نہ ہوتا

فلسطین اقوام متحدہ میں

سیاسی اغراض نے ایسے بیج پیدا کر دیئے کہ یہ مسئلہ لائیچل بن گیا۔ انستادب عرصہ میں برطانیہ کو جان و مال کا

چنانچہ اس تیل نے بین الاقوامی مہارت پیدا کر دی ہے۔ تیل اور سیاست ایک ہوتے جاتے رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے مالک اپنی مہماندگی کے طعنیل چونکہ خود تیل کی پیداوار سے قاصر ہیں اس لئے یہ نعمت عظمیٰ ان کے لئے وبال جان بن گئی ہے۔ روس اور امریکہ کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ فلسطین کی اہمیت پھر بڑھ جاتی ہے۔ کرکوک (عراق) سے تیل کی نالی (پائپ لائن) حیضہ (فلسطین) میں منہتی ہوتی ہے۔ حیضہ سے آگے تیل بذریعہ بحری جہاز لے جایا جاتا ہے۔ یہ لائن چھ سو بیس میل لمبی ہے۔ اس سے اس علاقہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فلسطین کا انتداب اور دیگر متبادل تجاویز اسی سیاسی تسلط کی غمازی کر رہے ہیں جو استعماری قوی کے لئے ناگزیر رہا ہو گیا ہے۔

اس پس منظر میں کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ اقوام متحدہ فلسطین کے معاملہ کو حق و صداقت کے اصولوں کے مطابق طے کریں گی۔ اس پس منظر سے اقوام متحدہ کی تضاد اور احمقانہ حرکات فہم ہو جاتی ہیں۔

بہر کیف فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہو گیا۔ اقوام متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی گیارہ ارکان پر مشتمل متعین کی جو فلسطین میں جا کر حالات و کوائف کا مطالعہ کرے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی مذکورہ نے ڈھائی ماہ کے بعد رپورٹ پیش کی۔ ایک اکثریت کی جس پر سات ارکان کے دستخط تھے اور دوسری اقلیت کی جس پر تین ارکان کے دستخط تھے۔ (ایک رکن غیر جانبدار رہا) اکثریت کی رپورٹ نے تقسیم کی تجویز پیش کی اور اقلیت نے ایسے وفاق کی جس کے اجزا عربی اور یہودی ریاستیں ہوں۔ عربوں نے ان میں سے کسی تجویز کو بھی قبول نہ کیا لیکن یہودیوں نے اکثریت کی رپورٹ کو منظور کر لیا۔ اقلیت کی رپورٹ کو یوں بھی اقوام متحدہ کے حلقوں میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اقوام دو صنفوں میں بٹ گئیں، ایک تقسیم کے حق میں اور دوسری تقسیم کے خلاف یعنی عربی و حدانی حکومت کے حق میں۔ اس پر فلسطین کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنادی گئیں جو متعلقہ تجاویز پر رپورٹیں غور و خوض کریں اور اپنی سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی نے ان ارکان پر مشتمل تھی جو تقسیم کے حامی تھے۔ دوسری سب کمیٹی و حدانی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی (اس میں چھ عرب ریاستیں اور افغانستان اور پاکستان تھے) پہلی سب کمیٹی کی صدارت مندوب پولینڈ کے سپرد تھی اور دوسری کی مندوب پاکستان سر ظفر اللہ خاں کے سپرد۔

تقسیم کا فیصلہ

سب کمیٹی نے اپنی مدلل و معقول رپورٹ میں اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جمیۃ اقوام متحدہ تقسیم فلسطین کی مجاز نہیں۔ یوں تو آنجہانی مجلس اقوام کو بھی یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب کر دے لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ مجلس تو عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے حقوق و اختیارات کسی دوسری مجلس کے نام منتقل نہیں کئے تھے۔ اقوام متحدہ بالکل نیا ادارہ تھا۔ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا قانونی حق و اختیار نہیں تھا۔ چہ جائے کہ وہ تقسیم کا فیصلہ صادر کرنا اور پھر اسے خواہی خواہی مسلط کرنا۔ اس کے علاوہ جب انتدابی حکومت نے اعلان کر دیا ہے کہ انتداب ختم کر دیا جائے گا تو فلسطین کو لامحالہ آزاد ہونا چاہئے نہ کہ اقوام متحدہ میں تحویل میں آجانا چاہئے۔ اقوام متحدہ کو اس ضمن میں برطانیہ کی تائید حاصل نہیں تھی۔ برطانیہ نے اپنی روش ایسی کرنی تھی کہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد ہے۔ وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں۔ برطانیہ ان کے فیصلہ کا پابند ہوگا لیکن خود کسی قسم کی رائے یا مشورہ نہیں دے گا۔ وہ نہ تقسیم کے حق میں ہے نہ تقسیم کے خلاف۔ وہ اس فیصلہ کی تائید کرے گا جسے عرب اور یہود دونوں تسلیم کریں گے۔ برطانیہ نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب ختم کر دے گا اور فلسطین خالی کر دے گا۔ اختتام انتداب تک وہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرے گا اور امن و امان کا نہاں ماحفظ ہوگا۔ اس کی فوجیں یکم اگست تک فلسطین سے نکل آئیں گی۔ ۱۵ مئی کے بعد وہ فلسطین کے لئے ذمہ دار نہیں ہوگا۔

اس سب کمیٹی نے منشور اقوام متحدہ کے پہلے ضابطہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی جس میں مذکور ہے کہ اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اقوام کو حق خود اختیاری میسر آئے اور وہ اپنی حکومت اپنی رضامندی سے طے کریں۔ اس کے مطابق فلسطین کا فیصلہ اہل فلسطین کے سپرد ہونا چاہئے تھا نہ کہ اقوام متحدہ کے سپرد۔

شاہ پرنیڈ کے مندوب یعنی سب کمیٹی کے صدر نے سب کمیٹی کے صدر سر ظفر افسدہ خاں کے سامنے اعتراف کیا، آپ کی رپورٹ ہماری رپورٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ بقول ظفر افسدہ خاں اس سے اس کا مقصد سفارشات کی تائید نہیں تھا۔ بلکہ ملامت و انداز استدلال کی تعریف تھی۔

یہودی تارکین وطن کے داخلہ فلسطین سے متعلق کمیٹی مذکورہ نے بتایا کہ چونکہ فلسطین اب تک تین لاکھ یہودی یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے اس لئے اس کے رقبے، ذرائع اور دیگر عناصر کے پیش نظر اس داخلہ کو بند کر دینا چاہئے اور یہودی مسئلہ کو بین الاقوامی خطوط پر طے کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشورے دیئے گئے:

۱، جن یہودیوں کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے (اب چونکہ یورپ میں ان پر وہ ظلم و ستم نہیں ہو رہا، اس لئے) ان میں سے جتنے بھی ممکن ہوں اپنے گھروں میں واپس کر دیئے جائیں۔

۲، جو آسانی اپنے گھروں میں واپس نہیں بھیجے جاسکتے ان کو ارکان اقوام متحدہ میں ان کی حکومتوں کی آبادی، رقبہ، ذرائع اور گنجانش کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

۳، ایک ایسی کمیٹی مرتب کی جائے جو ہر ملک میں یہودیوں کے سامنے کی تعداد وغیرہ مقرر کرے۔

فلسطین کی آئندہ حکومت وحدانی طرز کی تجویز کی گئی جن میں تمام اقلیتیں شریک ہوں اور ان کے لئے مناسب تحفظات ہوں۔

یہ سفارشات تبصرہ سے مستغنی ہیں اور مسئلہ زیر نظر کا صحیح حل ہیں۔ لیکن حل کی صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقوام متحدہ کے پیش نظر تو متضاد سیاسی مصالح تھے جن میں تطبیق محال تھی۔ لہذا حل ناممکن!

کمیٹی نے تقسیم کے حق میں سفارش کی۔ رسمی مراحل کے بعد معاملہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی میں مباحثہ کے لئے پیش ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ کیسے ہوا؟ یہ دلچسپ داستان ہے اور ہم مختصراً سر نظر انداز خاں کی زبانی پیش کرتے ہیں:

۲۷ نومبر امریکہ کا تہوار ہوتا ہے جسے یوم ٹشکر (Thanks giving) کہا جاتا ہے۔

اس لئے ہر ملک حتیٰ کہ صدر تک کی خواہش تھی کہ نشست ۲۶ (بدھ) کی نیم شب تک ختم کر دی جائے۔

اسی اعتبار سے جانیئین نے اس دن اپنی ساری قومیں مرکوز کر لیں۔ تقسیم کے خلاف ۱۶ ووٹ

جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ ایسے معاملوں کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے

تقسیم کے حق میں ۳۲ ووٹ درکار تھے۔ یہ قریباً ناممکن سا نظر آتا تھا۔ ہیں یقین ہو گیا تھا کہ

ہم نے میدان مار لیا ہے اور تقسیمِ دکن ہو گئی ہے۔ اس اثنا میں انوار مشہور ہو گئی کہ سیشن ملتوی ہو جائے گا اور ۲۸ تاریخ یعنی جمعہ کو منعقد ہو گا اور اسی دن ووٹ بھی لئے جائیں گے۔ صدر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ دو دن کے وقفہ سے ہمارے ووٹ ضائع ہو جائیں گے لیکن کسی نامعلوم شخص نے التوار کے لئے کہا اور بالآخر سیشن ملتوی کر دیا گیا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ گذشتہ سال یومِ شکر کو اسمبلی کا سیشن منعقد ہوا تھا لیکن اب یہ بہانہ کر دیا گیا کہ اس دن کو چونکہ امریکہ کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے سیشن منعقد نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقفہ میں نیویارک کے اخبارات میں خبر آئی کہ یہودی لیڈر ڈروین سے ملے۔ انھوں نے یہ دعویٰ دی کہ اگر تقسیمِ ناکام ہو گئی تو بحالی یورپ کا بل ناکام کر دیا جائے گا۔ امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلیفون اور تار کے ذریعہ کئی تقسیم کے حامی مندوبین کی حکومتوں سے مصروف گفتگو ہوا اور انھیں اپنی بیبیات بدل دینے پر مجبور کیا۔ اس پر ہمارے ووٹ ۱۳ رہ گئے۔ ایسے مندوبین نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ ان کی حکومتوں نے حکم دیدیا ہے کہ ووٹ تقسیم کے حق میں دیئے جائیں۔ مثلاً (Haiti) کے نمائندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اس نے کہا کہ ہم نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے لیکن ہمیں اس کے حق میں رائے دینے کی ہدایت آگئی ہے۔

مسٹر روز ویلیٹ نے کہ آنجنابی صدر روز ویلیٹ کے پوتے ہیں مڈل ایسٹ جرنل کی اشاعت جنوری ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ میں مسئلہ تقسیم کے فیصلہ کے وقت صیہونی دباؤ کا یوں ذکر کیا ہے:

ارکانِ اقوام متحدہ پر اثر ڈالنے کے لئے (تاکہ وہ جنرل اسمبلی میں تقسیم کے حق میں ووٹ دیں) ... ٹیلیفونوں، تاروں، خطوں، ملاقاتوں اور سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا طوفان اٹھا چلا آ رہا تھا۔ یہودیوں نے ان اقوام کو جو تقسیم کے خلاف رائے دینا چاہتی تھیں تقسیم کے حق میں رائے دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ عارہ تھا اس کا جو کچھ نیویارک سٹیٹ کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت ہے اس دولتِ غلطی کی جس کے سپرد دوسری عالمگیر جنگ نے اقوامِ عالم کی قیادت کر دی ہے اور

یہ ہے منظر اس ادارہ اقوام متحدہ کا جو اس لئے معرض تشکیل میں آیا کہ کرہ ارض سے جنگ کو بدر کر دیا جائے اور اقدار انسانیت کو مستقل حیثیت دے کر امن و امان کو عام اور پابندہ کیا جائے۔ عراقی نمائندہ کے الفاظ میں صدر ٹرومین نے ہی فلسطین کو آگ لگا ئی ہے اور وہی اسے بجھا سکتا ہے۔ جنرل سرائین کنگم، فلسطین کے آخری برطانوی ہائی کمشنر نے ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک بیان میں کہا کہ اگر بیرونی مداخلت نہ ہوتی تو برطانیہ خوش اسلوبی سے مسئلہ فلسطین کو حل کر لیتا۔ یہ بین الاقوامی ریشہ دو دنیاں سیاست دولِ عظمیٰ کا خطرہ اے امتیاز ہیں اور انہی نے فلسطین کو عقدہ لانا نکل بنا رکھا ہے۔

ان حالات میں ۲۹ نومبر کو جنرل اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ صادر کر دیا۔ ۵۷ ووٹوں میں سے ۳۳ تقسیم کے حق میں تھے، ۱۳ مخالف، دس ارکان غیر حاضر رہے۔ رائے شماری کا نتیجہ یہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ امریکہ باوجود ساری ریشہ دوانیوں کے دو تہائی ووٹ حاصل نہیں کر سکا۔ جو ارکان غیر حاضر تھے وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ گویا کہا جاسکتا ہے کہ ۳۳ کے مقابلہ ۲۳ ووٹ تھے۔ یہ کثرت رائے تو ہے دو تہائی ووٹ نہیں بہر کیف تقسیم کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ امریکہ نے یہودی ووٹوں کی خاطر بلا سوچے سمجھے اقوام متحدہ کو صحرا میں جھونک دیا۔ قبل اس کے کہ امریکہ کی مشکلات کا ذکر کیا جائے تقسیم کے مالک و اعلیٰ پر ایک طائرانہ نگاہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تقسیم کا خاکہ | اس فیصلہ کے مطابق فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ شلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ سارے ملک کو ایک مشترکہ اقتصادی بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا جس کے ارکان میں سے تین یہودی ہوں گے، تین عرب اور تین اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے نمائندے۔ ہر چہ فیصلہ تقسیم کا تھا لیکن مشترکہ اقتصادی بورڈ رکھ کر ایک مرتبہ پھر عملی اعتراف کیا گیا کہ اس ملک کی تقسیم ناقابل عمل ہے۔

یہودی سلطنت تین حصوں پر مشتمل تھی۔ شمال میں مشرقی گیلیلی جس کی سرحدیں شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ وسط میں تل عقیف (Tel Aviv) کی بندرگاہ اور ساحلی میدان، جنوب میں نجف (Negev) پہلی تجویز کے مطابق جافا کی بندرگاہ یہودی سلطنت میں شامل تھی۔ اس کے مطابق یہودی حصہ ملک میں پانچ لاکھ نو ہزار سات سو اسی (۵۰۹۷۸۰) عرب تھے اور چار لاکھ ننانوے ہزار بیس (۲۹۹۰۲۰) یہودی۔ گویا یہودی حصہ

۱۲ فروری ۱۹۴۷ء کی شب کو اس کمیشن نے رپورٹ شائع کی جس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ صورت حال انتہائی نازک ہے اور اس کے مزید گہرنے کا احتمال ہے۔ عربی قومی اندرون و بیرون فلسطین جنرل اسمبلی کے فیصلہ تقسیم کو بزور شمشیر بدلنے پر کمر بستہ ہیں۔ یہودی بھی علیٰ ہذا القیاس اپنے مطالبہ پورا نہ ہونے میں اختتام انتداب پر مکمل براہ منی پھیل جائے گی۔ کمیشن نے اس کے مقابلے کے لئے بین الاقوامی پولیس فورس کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ ایک لحاظ سے نیا نہیں تھا کیونکہ اس کا پہلے سے ہی احساس تھا۔ امریکہ اس زعم میں تھا کہ وہ محض رعب سے عربی حکومتوں کو خاموش کرادے گا اور اس کے لئے قوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عرب روز بروز اپنے مطالبات میں تشدد ہوتے جا رہے تھے۔ فلسطین کی مجلس اعلیٰ نے فلسطین کمیشن کو بتایا کہ عرب یہودی ریاست کی تشکیل کی ہر کوشش کو اقدام جنگ سمجھیں گے۔ اور اس کا پورا مقابلہ کریں گے۔ عرب لیگ کے جنرل سکرٹری عزام پاشا نے ۷ فروری کو اعلان کیا کہ اگر تقسیم کو قوت کے بل بوتے پر مسلط کیا گیا تو باقاعدہ عربی فوجیں تقسیم کا مقابلہ کریں گی۔ عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امریکہ کے کمزور ترین نقطہ پر حملہ کیا۔ مارچ کے اوائل میں نیویارک ٹائمز کے نام نگار متعینہ قاہرہ نے یہ خبر بھیجی کہ عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ امریکی کمپنیوں کو اجازت نہیں دے گی کہ وہ ارکان عرب لیگ کی ملکوتوں کی حدود میں پائپ لائنیں بچھائیں۔ شام کے متعلق خبر آئی کہ اس نے امریکی کمپنی کے اس اجارہ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا ہے جو چھ ماہ پیشتر طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ مصر بھی عرب لیگ کے فیصلہ کا پابند ہوگا اور حجاز بھی غالباً موجود کمپنیوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے گا۔ حالات نے امریکہ کو یقین دلادیا کہ عرب گیدہ بھبکیاں نہیں دے رہے بلکہ وہ واقعی ایسے عظیم رکھتے ہیں۔ فلسطین کمیشن نے عربوں کے عزم غیر متزلزل کی تصدیق کی تو امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ ٹرومین نے محسوس کیا کہ وہ یہودی دوٹوں پر عربوں کو آسانی سے قربان نہیں کر سکتا۔

فلسطین بین الاقوامی پولیس کے مسئلہ نے اور مصیبت پیدا کر دی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو امریکہ نے تقسیم کا فیصلہ منظور کرایا تھا۔ اس وقت سے بیکاراب تک کے پانچ مہینوں میں بین الاقوامی صورت حال اور نازک ہو گئی تھی۔ چیکو سلوواکیہ میں دیکھتے دیکھتے اشتہار کی حکومت مسلط ہو گئی تھی۔ خرس روس کا سایفین لینڈ

پر پڑ رہا تھا۔ امریکہ روس کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی نگاہ شمال میں ناروے پر تھی اور جنوب میں اٹلی پر آئی میں انتخابات ہونے والے تھے۔ پانچ مغربی قوتیں۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ۔ کے۔ این پچاس سال کا عسکری امداد کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ جسے امریکہ کی مارشل امداد کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ خود ڈروین ایک حد تک جبری عسکری تربیت کی اپیل کر چکا تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر امریکہ فلسطین میں بدامنی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بین الاقوامی فوجی مداخلت کا سوال بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اقوام متحدہ کے پاس منشور کی رو سے کوئی ایسی عسکری تنظیم نہیں تھی، اور اگر قومی انفرادی طور پر فوجیں ہیا کرتیں تو روسی فوجیں ضرور فلسطین آجینکتیں۔ امریکہ کسی حال میں بھی روسی فوجوں کو فلسطین میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ گونا گوں مصائب میں مبتلا ہو کر اور متضاد صورتوں سے دوچار ہو کر امریکہ نے رجعت کی اور ۱۹ مارچ کو اعلان کیا کہ وہ اب تقسیم کا موید نہیں رہا۔ اس کے خیال میں فلسطین کو عارضی طور پر تولیت (Trusteeship) میں دیر یا جائے۔ نفاذ تقسیم میں جو خطرات و مہالک تھے اور جو سب کو صاف نظر آ رہے تھے، امریکہ نے ان کا انکار کیا۔ لیکن بالآخر اسے بہت جلد ان کی بے پناہی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس رجعت سے اس کے نہ محض اپنے وقار کو صدمہ پہنچا بلکہ اقوام متحدہ کے ادارہ کو ایک بیکار اور کھوکھلا ادارہ ثابت کر دیا۔ فلسطین اقوام متحدہ کی آزمائش تھا لیکن وہ اس میں پوری نہیں اتری۔ اس جمعیت نے پورے تیرہ مہینے فلسطین کے معاملہ پر بحث و تمحیص کی لیکن ناکام رہی۔ لیکن تقسیم ناقابل عمل نہیں ہے۔

امریکہ نے عارضی تولیت کی جو تجویز پیش کی وہ بھی مندرجہ ذیل تھی۔ اسی بیت و
نئی صلیبی جنگ
 اصل، گوگوارڈنڈنڈب میں ۱۵ مئی کی فیصلہ کن تاریخ آجینکتی۔ برطانیہ فلسطین کو خالی کر کے رخصت ہو گیا۔ یہودیوں نے اسرائیلی سلطنت قائم کر لی اور فلسطین ایک اور صلیبی جنگ کا میدان بن گیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں دوسری صلیبی جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد صلیبی آج تک خطرے کا باعث نہیں بن سکے تھے۔ آل اسرائیل جو ایک دفعہ الہی انعام و فضائل سے محروم ہو کر تین ہزار سال سے اب تک لعنت و ذلت و مسکنت کی وادیوں میں سرگرداں رہی ہے۔ آج اپنی ساری

شیطنت کاریوں کے ساتھ قبلہ اول کی مقدس گلیوں میں تہذیب و انسانیت کو ذلیل و رسوا کر رہی ہے یہودی جس "تابوت سکینت" کے طاوت کے عہد میں بھی مستحق نہیں تھے اور وہ انھیں بطور انعام خداوندی عطا ہوا تھا، تاکہ انھیں "ظالمین" کے بجائے "صابرین" اور "مومنین" بننے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آل اسرائیل فطرت کی مہلت بخشیموں سے کبھی استفادہ نہیں کر سکی۔ وہ حضرت موسیٰ کے ساتھ چالیس سال صحراؤں میں آوارہ نہیں رہی بلکہ تاریخ کے سارے دور میں وہ صحرا سے نکل کر کسی "مصر" میں داخل نہیں ہو سکی۔ آج وہ دنیا بھر کو لباس، خوراک اور دیگر مشینائے ضروری سے متعلق گونا گوں مصائب میں مبتلا کر کے سودر سود اور چور بازار کے ذریعہ کمائے ہوئے سرمایہ سے حاصل کردہ قوت اور اسلحہ سے وہی "تابوت سکینت" حاصل کرنے پر مضطرب ہیں جو قوت اور سرمایہ سے نہیں بلکہ قانون مشیت ایزدی کے تحت ملتا ہے۔ لیکن جو قوم فیضانِ سماوی سے محروم ہو جاتی ہے اس کے عمل و کمالات کی حد یہی فساد و طغیان ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے ۱۵ مئی کے بعد فلسطین میں "اسرائیلی حکومت" کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کا مرکز تل عقیف ہے۔ اس حکومت کی حیثیت کیا ہے اور اس کی سرحدیں کونسی ہیں؟ یہ خود یہودی بھی نہیں جانتے لیکن بین الاقوامی سیاست کی طفلانہ حرکتوں نے اس حکومت کو کاغذی نہیں رہنے دیا۔ اسی سال امریکہ کا صدارتی انتخاب ہوا ہے صدر ٹرومین گذشتہ انتخاب کے موقع پر نائب صدر منتخب ہوا تھا۔ لیکن روز ولایت کی موت پر آئین کے مطابق صدر بن بیٹھا۔ وہ اس منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ڈیموکریٹک پارٹی جس کا کہ وہ نایندہ ہے گذشتہ سولہ سال سے برسرِ اقتدار ہے۔ بعض حلقوں میں اسی وجہ کو اس پارٹی کی شکست کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ٹرومین ہر وہ حرکت کرنے کے لئے تیار ہے جو اسے صدر بنائے رکھنے میں مفید ہو۔ یہودی اہم ہرہ ہیں۔ چنانچہ ادھر یہودیوں نے بے بنیاد اسرائیلی حکومت کا اعلان کیا اور صدر ٹرومین نے اسے تسلیم کر لیا۔ شکاگو ٹریبون نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸ مئی کی اشاعت میں لکھا:-

ڈیموکریٹک عجلت میں ٹرومین نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ (اسرائیلی حکومت تسلیم کرنے میں) ٹرومین

نے آدھ گھنٹہ کا بھی انتظار نہیں کیا۔ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ

حکومت کیا ہے اور اس کی حدود کو نبی ہیں۔ ٹرومین نے یہ کچھ جاننے کا انتظار نہیں کیا۔ اس کی نظر یہودی دوٹوں پر تھی۔ یہی اس کی عجلت کی علت ہے۔

شرق اردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ شرق اردن کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پر حفاظتی کونسل نے کئی مرتبہ سفارش کرنے سے انکار کیا ہے لیکن امریکہ نے یہودی حکومت کو فوراً بلاوجہ تسلیم کر لیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امریکہ کی یہ طفلانہ غیر ذمہ داری بلاوجہ ہے!

امریکہ کے اقدامات میں شریک ہونے کے لئے روس نے بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ امریکہ کے لئے یہ اور مصیبت پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے روس ہی کے ڈر سے تو تقسیم کا فوجی قوت سے نفاذ نہیں کیا تھا۔ روس پھر اس کے مقابل اکھڑا ہوا ہے۔ بین الاقوامی سیاست ایک دوری گردش بنی جا رہی ہے۔

بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ اسرائیلی حکومت انہی علاقوں میں قائم ہوگی جو فیصلہ کے مطابق اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہودیوں کے سپرد کئے تھے۔ یہ استدلال باطل ہے۔ کیونکہ اقوام متحدہ کا فیصلہ تقسیم ختم۔ دفن ہو چکا ہے۔ خود امریکہ کے ایما پر اور امریکہ کے ہاتھوں۔

بہر حال اب صورت یہ ہے کہ عرب لیگ کی رکن حکومتیں خصوصیت سے لبنان، شام، شرق اردن، عراق اور مصر فلسطین میں مصروف جنگ ہیں۔ یغینیت ہے کہ انھوں نے کم از کم فلسطین کے معاملہ میں اپنے باہمی اختلافات کو مالا ئے طاق رکھ دیا ہے۔ عرب لیگ کا یہ کارنامہ اہم ہے اور مستقبل کے لئے خوش آئند۔

طلوع اسلام عربوں کے اس جہاد حریت میں اس سے بہتر پیغام نہیں دیکھتا جو علامہ اقبالؒ فلسطینی عرب سے کہہ چکے ہیں:

زبانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ

میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں

فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات

خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

عربوں بلکہ مسلمانوں کا دعویٰ تاریخی، آئینی اور اخلاقی اعتبار سے برحق ہے۔ استعمارِ فرنگ نے پہلو بدل کر اس کو دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کی جو کوششیں کی ہیں اور جن کا جائزہ اوپر لیا جا چکا ہے وہ ایک ایک کر کے ناکام ہوئیں۔ اس لئے ناکام ہوئیں کہ ان کی بنیاد باطل تھی اور باطل بنیادوں پر حقیقی عمارت قائم نہیں کی جاسکتی۔ فلسطین عالم اسلامی کا مرکزی مسئلہ ہے۔ یہ مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ اس کی مرکزیت اب بھی باقی ہے۔ جملہ عالم اسلامی اس نقطہ پر آج متفق و متحد ہے۔ فلسطین کا حادثہ عظیم اتفاق و اتحاد کی نعمت بخش دے تو سودا سستا ہے۔ اس وقت مللِ اسلامیہ اپنے اپنے مصائب میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ بین الاقوامی مابقت میں وہ پیچھے رہ گئی تھیں۔ انڈونیشیا، فلپائن، ملائیا، جنوبی سیام، مشرقی پاکستان، شمال مغربی چین، وسطی ایشیا، مغربی پاکستان سے بحرِ روم کے جنوبی ساحل تک مسلمان اندرونی انقلابات سے دوچار ہیں۔ ان کی مصائب عظیم الشان ہیں اور مشکلات ہم۔ گنبد نیلوفر کی یارنگ بدلتا ہے اور اس بھر کی تہ سے کیا اچھلتا ہے؟ ان سوالات کا جواب پردہ تقدیر میں ہے لیکن لا تھنوا ولا تھزنوا، اور لیکن اللہ رُحی پر ایمان رکھنے والے یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ خوف و حزن کا مقام نہیں، یہ ظلمت کا وہ دورِ آخری ہے جو روشنی سے فریب تر ہوتا ہے۔ ستاروں کی تنگ تابلی بلکہ خونِ صد ہزار انجم — صبحِ روشن کی دلیل ہے۔ یہ سب تیاری ہے — بھی حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ مطلع فجر کی ساعت آہنچی ہے۔ وہ وقت۔ دور نہیں کہ اَشْرَقَتْ الْاَرْضُ بِمُورِدِهَا۔ آفتاب سوائزرے تک آچکا ہوگا۔

عالمِ نو | عرب ممالک میں ہنوز اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی علت شخصی حکومتیں ہیں۔ حسین شریف مکہ کی اولاد، ابن سعود کے ہاتھوں حجاز و عرب سے محروم ہو گئی ہے لیکن شرقِ اردن اور عراق اس کے قبضہ میں ہے۔ وہ ابن سعود کو غاصب سمجھتی ہے اور خلافت قائم کر کے خلیفۃ المسلمین بن جانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ ابن سعود اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتا ہے کیونکہ اس کے قبضہ میں مکہ ہے۔ شاہِ فاروق بھی اس دور میں سمجھے نہیں، وہ خدمتِ کعبہ کی وجہ سے خلافت کا استحقاق ظاہر کر رہا ہے۔ فلسطین میں نیشامی خاندان اور حسینی خاندان کی رقابت ۱۹۲۲ء میں ایک جد تک ختم ہوئی جبکہ جہاد حریت کی قیادت حتمی طور پر مفتی امین العیسوی کے سپرد ہو گئی۔ حسینی قیادت عبد اللہ والی شرقِ اردن

کی راہ میں اہم رکاوٹ ہے۔ نوبائٹم کی فلسطین، حجاز وغیرہ پر نگاہ ہے کیونکہ قیام خلافت کے یہ اہم نقطے ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ میں حسین نے انگریزوں سے میکوس کی زبانی یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ برطانیہ عربوں میں ایسی خلافت قائم کرنا چاہتا ہے جس کی قیادت آل ہاشم کے ہاتھ میں ہو۔ عراق اور شرق اردن کس حد تک اس آرزوئے خلافت سے پاک ہو چکے ہیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اتنا غنیمت ہے کہ فلسطین کے مسئلہ پر متحد ہو گئے۔

یہ وقت مسئلہ خلافت پر بحث کرنے کا نہیں۔ اس پر طلوع اسلام میں وقتاً فوقتاً روشنی ڈالی جاتی ہے۔ لہذا اس وقت اسی اجمال پر اکتفا کی جاتی ہے کہ خلافت اسلامیہ شخصی حکومت کا نام نہیں۔ یہ نہ قوت کے بل بوتے پر مل سکتی ہے نہ وراثتاً حاصل ہو سکتی ہے۔ خلافت ملل اسلامیہ کی مجموعی اور مشترک حکومت ہے، وہ حکومت جس کے جملہ اجزاء شریک حکم ہوں نہ کہ محکوم، محکوم ہوں تو سب خدا کے۔

اس وقت فلسطین میں صرف عربی فوجیں لڑ رہی ہیں۔ ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان شریک جنگ نہیں ہوئے۔ فلسطین کے لئے عرب اور غیر عرب کی تقسیم متحسین نہیں۔ فلسطین عربوں کا نہیں مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان کرۂ ارض پر کہیں بچتے ہوں وہ اس کی حرمت پر کٹ مرنے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ لہذا اس نقطہ پر تمام ممالک اسلامیہ کو مرکز ہو جانا چاہئے۔

پاکستان میں اس وقت فلسطین سے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس افسوسناک حقیقت کا مظہر ہے کہ پاکستان کی حکومت سابقہ اجنبی حکومت ہے جسے فلسطین سے وہ جذباتی وابستگی نہیں جو عوام کو ہے جلد عوامی مظاہرے غیر سرکاری طور پر ہو رہے ہیں۔ بغیر حکومت کے عملی اقدام مشکل ہے۔ حالیہ پریس کانفرنس میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ حکومت پاکستان عربوں کو کیا امداد دے گی، سر ظفر افسندہ خاں نے کہا کہ حکومت نے ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ یہ تاخیر اور سز مہری ہے۔ کیا حکومت اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریگی اور عوام حکومت سے علیحدہ ہو کر نہیں بلکہ حکومت کو ساتھ ملا کر مناسب اقدام کریں گے؟ ہندوستان کے مسلمان خاموش ہیں۔ ہمیں ان کی مجبور یوں کا علم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حکومت ان کی نہیں، لیکن اس کی مشترک حکومت بھی تو ان کی نہیں تھی۔ وہ بھی کم استبدادی نہیں تھی۔ حق کی بات جب کہی جاسکتی تھی تو

اب بھی کہی جاسکتی ہے۔ حکومت ہندوستان کی ہمدردی کسی سے بھی کیوں نہ ہو، وہ مسلمانوں کو عربوں سے اظہار ہمدردی کرنے سے روک نہیں سکتی۔ اور اگر وہ روکنے پر ہی اتر آتی ہے تو پھر اس بستی میں کیا رہنا جس کے 'اہل' اس قدر ظالم ہوں!

عمومی حیثیت سے عالم اسلامی میں زندگی کی نئی تڑپ محسوس ہو رہی ہے۔ پاکستان کے قیام نے ممالک اسلامیہ میں پیش بہا اضافہ کیا ہے۔ پاکستان اور فلسطین فیصلہ کن نقطے اور ہماری آزمائش میں۔ لِنَدْرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ کے مصداق مثبتیت ہمیں میدانِ عمل دے کر یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ہم کس حد تک اس کے مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ رب العزت جنہیں ملک عطا کرتا ہے وہ نظامِ صلوة و زکوٰۃ قائم کرتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ ممالک اسلامیہ بالخصوص پاکستان کے لئے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے

پیش کر اپنا عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

ہم نام کو آزاد ہیں لیکن غلامی سیاسی غلامی ہی نہیں ہوتی۔ ذہنی سلاسل میں گرفتاری وہ غلامی ہے جو انسانیت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ حقیقی آزادی ان اطوار و سلاسل سے نجات ہے اور یہ نجات بقول اقبال

خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

ہماری ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ انگریز کے پنجہ استبداد کے خلاف مسٹر گاندھی کی انفعالی سیاست نے احتجاج کے جو طوق و انداز وضع کئے تھے، ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی حد پر واز کو ان سے آگے نہیں سمجھتے۔ چنانچہ فلسطین کے حادثہ غطفلی کی خبر ملنے کے بعد ہم نے جو کچھ آج تک کیا ہے وہ سیاہ جھنڈیوں، جلسوں، جلسوں، ریزولیشنوں اور پٹریٹوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم ابھی تک سمجھے ہی نہیں کہ یہ انداز احتجاج ہمارے عہد غلامی کی بلبلی و بے بسی کے ماتم گزار ہیں، زندہ قومیں اپنے احتجاجات کے مظاہرے تلواروں کی چمک اور نیزوں کی کھنک سے کیا کرتی ہیں۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔ صدیوں کی خونے غلامی ہمارے رگ و پے میں اس درجہ سرایت کر چکی ہے کہ ہم نفس کی تیلیوں سے ماوراء کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

وہ فریبِ خود شاہیں کو پلا ہو گرسوں میں اسے کیا خبر کہ کیا ہے وہ ورسم شاہبازی

باقی رہی ہماری حکومت۔ تو ہم حیران ہیں کہ اسے کن الفاظ میں سمجھائیں کہ حضور رسالت نے کہ جن کے پیام رحمت نے نوع انسان کے افراد منتشرہ کو کاروان اور اقوامِ دہل کے نجوم متفرقہ کو کہکشاں بنا دیا، جب فرمایا تھا کہ تمام روئے زمین کے مسلمان ایک جد واحد ہیں تو اس سے مقصود اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اگر کسی پاؤں کے انگوٹھے میں کتنا چھبے تو آنکھ کے آگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ اگر افریقہ کے صحراؤں میں کسی حبشی کے سر میں درد ہو تو ایران کے سبزہ زاروں میں موج گشت شاہنشاہ کا تاج اس کے لئے وبالِ روش ہو جائے۔ اگر شام کے میدانوں میں کسی اونٹ چرانے والے کے سینہ پر کسی ناسخار کا تیر آگے تو اس کی اتنی چین کے حملات میں سونے والے خاقان کے کلیجے سے نکلے۔ اگر مرآش کے چرواہے کے خیمے کی طناب کو کوئی دشمن بیضا کاٹ ڈالے تو قلعہ تلخیز کے قصرِ احمر کے ستونوں میں تزلزل واقعہ ہو جائے۔ نہیں! اگر دشتِ حجاز میں کسی بیوہ کے بچے کی طرف کوئی نگاہ بد سے دیکھے تو تمام عالمِ اسلامی کی آنکھیاں اس کی آنکھ نکال لینے کے لئے بیک وقت اٹھ آئیں۔ سو قسم ہے اس خدائے کل کی کہ جس نے تمام روئے زمین کے کلمہ پڑھنے والوں کو کل مومنِ اتحۃ کے رشتہ محکم میں منسلک کر کے ملتِ حنیفہ کی یوں شیرازہ بندی کر دی ہے آج جبکہ فلسطین کے میدانوں میں عرب مجاہدین کا خون 'ہانڈاز نو' قانونِ باغبانی صحرا کی نوشت میں صرف ہو رہا ہے۔ اگر صحرا میں پر کسی ایک مسلمان کو بھی چین کی فینڈ آجائے تو قیامت کے دن 'لیس منی' کی شدید لعنت کا استقبال کرے گی۔ سو اس کے بعد کیا ہے کہ ہمیں اس کھلے ہوئے فیصلہ کے اعلان سے روکنا ہے پاکستان کی آزادی کے بعد یہ پہلا موقع آیا ہے کہ وہ دنیا کو بتادے کہ مسلمانوں کا شمار یہ ہے کہ

ایک ہوں سارے حرم کی ہا سانی کے لئے نیل کے ساحل سے لیکر تاجکستان کا شغیر

آج فلسطین کے ارض مقدس کا ذرہ غمہ پکار رہا ہے کہ من انصاری الی اللہ!

اے بندۂ مومن! تو کھائی؟ تو کھائی؟

دیکھیں۔ سخن انصاری اللہ کہنے کی سعادت کس کس کے مقدر میں لکھی ہے۔

خانہ کلام سے پہلے ہم ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ادا فروری سمجھتے ہیں جس میں مسلمان ایک

تائید و نصرت ان کے ساتھ ہوگی۔ جو انکی مادی کمی کو ہر طرح سے پورا کر دے گی۔ اور اس وقت خدا کا یہ ٹیل
 وعدہ پورا ہو جائیگا کہ وَلَنَجْعَلَ لِكُلِّ فِرْعَوْنَ عَلِيًّا (۱۳۱) اللہ ہرگز کفار کو مشرکین
 پر غلبہ نہیں دیگا۔

یہو کی منفہریت کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اعمال دکردار اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے جو خدا
 کی میزان میں شرط محبوبیت بنتے ہیں۔ ان کے اقوال و سوزناہ لیکن انداز سب کا فزانہ تھے۔ وہ زبان سے کچھ کہتے
 تھے جسے ان کے اعمال جھٹلاتے تھے۔ اس لئے اس روش زندگی کے ساتھ محبوبیت خداوندی (نحن انباء اللہ)
 کا دعویٰ حقیقت و صداقت کے ساتھ مذاق کرنے کے مراوت تھا جس کا نظری نتیجہ غضب و عتاب خداوندی ہوتا
 ہے کہ خدا کی نعمت و رحمت مشروط ہے ایمان و اعمال صالحہ سے۔ اس روش زندگی کا ترکیب یہودی ہوتی مسلمان
 ہوتو، دونوں منضوب ہوں گے۔ جنگ فلسطین میں کس زعم باطل میں کہ خدا ان کے ساتھ ہے اور مسلمان یہ سمجھے
 بیٹھے ہیں کہ خدا ان کے ساتھ ہے۔ اور خدا کا ارشاد یہ ہے کہ

لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ بَيْتِ الْمَسْجِدِ وَلَا مِثْلِهِ

مَنْ دُونَ اللَّهِ وَلِيَا وَلَا نَصِيحِينَ (۱۳۲)

خدا کی نصرت نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے، اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں پر اور نہ تو موقوف ہے
 ایمان و عمل پر، جو کوئی برائی کو سے گامزدی ہے کہ اس کا بدلہ پائے۔ پھر اللہ کے سوا کوئی لستہ دست نیگا

خدا کہتے ہی اسے میں جس کے قاذر و مکافات میں نہ کسی کی طرف ذاری ہونے کسی کی مخالفت۔ اس لئے اگر مسلمانوں نے
 خدا کو اپنے ساتھ ملانا ہے، تو اس کے بدلے ہوئے قاذر کے مطابق عمل کریں۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اپنے
 معاملات میں خدا کو پہنچ کر نہ لائیں۔ پھر یہ معاملات ان ہی آئین و دستور کے مطابق طے پائیں گے جن کے ماتحت یہ
 نظام چل رہا ہے۔ اگر دنیا بھر کے مسلمان اس ایک عمارت پر جمع ہو جائیں اور اپنے خدا سے عہد کر لیں کہ وہ انسانی
 حکومتیں قائم کرنے کے بجائے اللہ کی حکومت اختیار کریں گے اور جس سرزمین میں انہیں غلبہ حاصل ہوگا اس میں
 اس کے نازل کردہ ضابطہ قوانین کو نافذ کریں گے، اور اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیں۔ تو پھر دیکھئے اس ایمان
 عمل کا نتیجہ کس طرح انہیں دنیا بھر کی سرسبز زباں عطا کر دیتا ہے کہ

لَهُمُ الْعِلْمُ وَالرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَهْتَدُونَ

« علماء ہند »

آہ یہ وقت بھی آنے کو تھا الشغنی
 نہیں اپنوں کیلئے تلخ کلامی کے سوا
 علامتِ بیہنا کی کریں بیخ کنی
 نہایت غیروں کیلئے وقفہ شیریں سخن
 بہر اختیار کیا دیں سے سیاست کو جدا
 جس سیاچہ خود اپنوں کے لڑائی تھی ٹھنی
 کہہ سکتے ہیں وہ کب عشقِ حرم کا دعوے
 اُلفتِ دیر کو سمجھے ہیں جو حب الوطنی
 کیوں نہ برہم کرے جمعیتِ ملت کے شیخ
 اہلِ سمان برہم کی یہ برہمنی
 نامِ اسلام جو لیتا ہو وہ گردنِ دنی
 کیا تاشا ہے کہ دینِ عربی کا دشمن
 ایک مکی بنے اور دوسرا ٹھیرے مدنی

ان کے وعدوں کا بتوں کو بھی نہ آئیگا یقین

جو ردارکتے ہیں اللہ سے پمیاں شکنی

پیام اقبال

از عبد الرحمن طارق بی۔ اے

پیام اقبال اردو زبان میں اپنے موضوع پر وہ سب سے پہلی کتاب ہے جو علامہ اقبال کی زندگی ہی میں تیار ہو گئی تھی۔ یہ کتاب جب علامہ مرحوم کے حضور پیش کی گئی تو بعد از مطالعہ اذنا فرمایا: "اس میں خشک نہیں کچھ پیام اقبال"۔ میرے پیام و کلام کی نہایت حسین و موثر ترجمانی ہے اور اس سے میرے بعض اہم زاویہ نئے فکر، نظر و بصیرت افزور روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب میں اٹھارہ پر مغز اور فاضلانہ مقالات ہیں جنہیں سے ہر مقالہ حسب عنوان علامہ مرحوم کے دقیق فارسی وارد و کلام کی تشریح بھی کرتا ہے۔ انداز بیان نہایت فصیح و دلچسپ، تشریح اشعار سلی بخش اور زبان عام فہم ہے۔ اب میرا ایڈیشن نہایت حسین و جمیل صورت میں چھپا ہے اپنی فرمائش جلد روانہ فرمائیے کہ ختم ہونے پر پھر اخبار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ضخامت ۲۶۰ صفحات، قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے۔

دفتر اقبال کیڈمی ایک روٹ، ڈانار کلی لاہور